

خلش

خالد حسن قادری

خلش

اور دوسرے افسانے

خالد حسن قادری

پبلشر ———— ہاشمی بکڈپو لاہور

سول ایجنٹ

ادارہ ادبیات جدید ۳ کبیر سٹریٹ انارکلی لاہور

قیمت ———— دو روپے

تعداد ایک ہزار ایک سو ۱۱۰۰

سنہ ۱۹۴۴ء

پہلا ایڈیشن

فہرست مضامین

۱

دیباچہ

اُردو افسانہ نگاری اس سرعت کیساتھ منزلِ تکمیل و ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے کہ چند سال پہلے کے افسانے پُرانے سمجھے جاتے ہیں۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف حیات و معاشر، کردار و اخلاق کے اصُول و نظریئے تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور دُوسری جانب افسانہ نگاری کے مغربی اصُول و اسلوُب صحیح طور پر سمجھے اور برتے جا رہے ہیں۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ افسانے معیاری ہیں۔ ممکن ہے کہ افسانوی ادب کی الماری کے کسی گوشہ میں بھی جگہ نہ پا سکیں۔

میں انگریزی اور اُردو کے بہترین افسانے پڑھتا ہُوں اور ان سے میری طبیعت میں ایک ذوق اور دل میں ایک مزہ پیدا ہوتا ہے۔ اس وجدانی کیفیت سے متاثر ہو کر میں نے کبھی کبھی افسانے لکھے ہیں لیکن بغیر کسی حجاب کے مجھے اعتراف ہے کہ میں خُود اپنے ان افسانوں کے کامیاب یا ناکام ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ پڑھنے والوں نے بعض افسانے میری امید کیا تصوّر سے بھی زیادہ پسند کئے ہیں۔ لیکن اپنے معیار پسند کے وہ خُود جواب دِہ ہیں میں بری الذمّہ ہوں۔

اس مجموعہ میں اکثر افسانے بالکل طبع زاد ہیں۔ بعض میں صرف ایک خیال کہیں سے لیکر اپنا الگ اور نیا افسانہ لکھا ہے بعض افسانے ترجمہ کے ذیل میں آسکتے ہیں لیکن وہ بھی لفظی ترجمہ نہیں ہیں۔ بلکہ مشرقی و مغربی تمدن و معاشرت کے فرق کو مدنظر رکھ کر مشرقی ماحول کے مطابق افسانہ ڈھال لیا ہے ؎

عالم گنج۔ آگرہ ~~~~~~~~ خالد حسن قادری

Anwar Ahmad

صُوفیہ

صُوفیہ برابر اپنے کام میں مشغول تھی۔ اُس کی نازک مرمریں اُنگلیاں انگور کا خوشہ کاڑھنے میں مصرُوف تھیں۔ لیکن انیسہ برابر کمرے میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی تھی۔ کبھی میز پر سے یہ چیز اُٹھاتی کبھی وہ۔ کبھی دراز کھول کر اس کی چیزیں دیکھتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن بڑی بہن کی سنجیدگی اور مشغولیت کی وجہ سے کچھ ہمت نہیں پڑتی۔ اُس نے کچھ شعر گنگنانا شروع کیے۔ لیکن صُوفیہ برابر اسی طرح اپنے کام میں مشغول رہی۔ انیسہ کو اتنا صبر کہاں تھا۔ آخر اُس نے اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے سوال کر ہی دیا۔

"اپیا آپ کو معلوم ہے انور نے مجھ سے کیا کہا ہے؟"

"یقینی کوئی غیر دلچسپ بات ہوگی"۔

"آپ کا یہ جواب اخروٹ کے چھلکے سے زیادہ خشک ہے"۔

"انیسہ تم بہت شریر بچّی ہو!"

"یہ آپ کی دُوسری غلطی ہے۔ میں اب بچّی نہیں ہُوں آپ کو معلوم ہے میری اب شادی ہونے والی ہے"۔

"کیا؟"

"یہی تو انور نے مجھ سے کہا ہے"۔

"کیا بے وقوفی ہے۔ میں تمہارا ایک لفظ بھی نہیں سمجھی"۔

"ابھی میں آپ سے سب کہتی ہوں۔ لیکن کیا آپ کی سنجیدگی آپ کی تھوڑی سی توجہ ادھر مبذول کرنے کی اجازت دیگی؟"

"ہاں ہاں! لیکن جلدی کہو"۔

"سنہری صبح تھی ہم پولو کے میدان میں مریخ کی دنیا میں بیٹھے تھے آپ وہاں نہیں تھیں۔ آپ کو تو اپنی کتابوں سے ہی فرصت نہیں ملتی"۔

"اگر تم اس طرح افسانہ خوانی کروگی تو میں تمہاری بات نہیں سنوں گی۔ جلدی کہو جو کچھ کہنا ہے"۔

"آپ کو سننا پڑے گا۔ میں یہ بات آپ سے کہے بغیر نہ مانوں گی"۔

"تو پھر کہتی ہو یا نہیں"۔

"ہاں تو پولو کے میدان میں ہم اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے"۔

"ہم کون؟"

"میں رضیہ اور ممی۔ تھوڑی دیر کے بعد ارشد ہمارے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ ارشد کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔ اس دن ممی نے پارک سے لوٹتے میں ہمارا تعارف کرایا تھا۔ تو تھوڑی دیر بعد ریس شروع ہو گئی۔ میرا خیال تھا نمبر ۱۲ جیتے گا مگر ارشد کا خیال تھا نمبر ۱۴ جیتے گا۔ ہم دونوں نے دس دس روپے لگائے۔ اتفاق کی بات ارشد والا نمبر جیت گیا۔ میں اور ممی اکثر پارک میں ٹہلنے جاتی ہیں۔ وہ بھی ساتھ ہو لیتا ہے"۔

"اچھا"۔ صوفیہ نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی چمکدار آنکھوں میں افسردگی

کی جھلک آگئی۔

"آپ تو ہر وقت اپنی کتابوں میں گھسی رہتی ہیں۔ ممی نے اس کے متعلق مجھ سے پوچھا بھی تھا میں نے اس وقت تو کوئی جواب نہ دیا تھا لیکن اب یہ بات تقریباً طے ہو گئی ہے۔"

"اچھا" صوفیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "پھر؟"

"پھر کیا! میں شادی پر پہلن۔ نرگس، پائل اور شیلا کو بھی بلاؤں گی۔"

"لیکن.......... تم اس طرح شادی کرنے کو تیار ہو جاؤ گی؟"

"اس طرح سے کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"بغیر اس کو جانے ہوئے بغیر اس سے محبت کئے ہوئے۔"

"لیکن میں اس کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ کئی مرتبہ اس کو ریس کے میدان میں اور ممی کے ساتھ ٹہلتے پارک میں دیکھا ہے۔ میں اس سے محبت بھی کرتی ہوں پرسوں میں نے کھانا کھانے سے اسی لئے انکار کر دیا تھا کہ میں نے اس کو صبح سے نہیں دیکھا تھا۔ اور بجائے کھانے کے تین پیالیاں کافی کی اسی لئے چڑھائی تھیں کہ اس کے غم میں خودکشی کر لوں۔"

"لیکن وہ" صوفیہ نے انیسہ کی شرارت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا:۔

"وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ محبت بھی کرتا ہوگا۔" انیسہ نے مسکرا کر کہا۔ لیکن صوفیہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ انیسہ یہ سمجھی کہ شاید اس کی بات سے صوفیہ کو تکلیف پہنچی۔ اس نے صوفیہ کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور بولی "میری بات آپ کو ناگوار ہوئی ایسا؟"

"نہیں پیاری تم سچ کہتی ہو۔ جب محبت کرتے ہیں تب ہی شادی بھی کرتے ہیں محبت پیدا کرنا مشکل ہے۔" اُس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"محبت پیدا کرنا! محبت پیدا کرنا!!" انیسہ نے آہستہ آہستہ دہرایا۔ "لیکن اپیا یہ تو بہت آسان ہے۔ لیکن جب کوئی ہر وقت ناک بھوں چڑھائے رہے اور کبھی نہ مُسکرائے، ہمیشہ فلسفیوں کی طرح سوچتا رہے۔ ہر وقت چہرے پر سنجیدگی برستی رہے اور جب سب دوسرے کھیل رہے ہوں یا تفریح کو جا رہے ہوں اس وقت بھی پڑھتا رہے، جب کوئی ملنے آئے تو کبھی اس سے نظر ملا کے بات نہ کرے تو اپیا ایسی حالت میں محبت کرنا واقعی مشکل ہے۔"

صُوفیہ نے اپنا سر اور جُھکا لیا اور کچھ جواب نہیں دیا۔ اس کے ہونٹ ہلکی سی کپکپی کے بعد ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ جیسے وہ سسکی کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا میں نے آپ کو پھر تکلیف پہنچائی؟" انیسہ نے پوچھا۔ "میں چاہتی ہوں کہ کوئی آپ سے بھی محبت کرے۔ میں آپ کو دُلہن بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں کیسا اچھا ہو اگر ہم دونوں ایک ہی دن دُلہن بنیں۔"

"کیا بے وقوفی ہے۔ میں نہیں کروں گی شادی"

"نہیں اپیا۔" انیسہ نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارشد کے ایک بھائی اور بھی تو ہے۔"

"بدتمیز چپ رہو" صوفیہ سنجیدگی سے بولی۔

اُسی وقت ان کی ماں داخل ہوئی وہ کہیں جانے کیلئے کپڑے بدلے ہوئے تھیں

"ممی آپ کہیں جا رہی ہیں؟" انیسہ نے پوچھا۔

"ہاں میں ارشد کی والدہ کے پاس جا رہی ہوں۔"

"ارشد کی والدہ کے پاس!" انیسہ بولی۔ "تب تو واقعی ضروری بات ہوگی"

"ہاں تمہیں ابھی معلوم ہو جائیگا۔ صوفیہ تم ذرا میرے ساتھ چلو۔"

"کیا آپا کو بھی ارشد کی والدہ سے کچھ ضروری کام ہے۔" انیسہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"انیسہ! اب تم اپنی شرارتیں کب چھوڑو گی؟ ذرا آدمی بنو۔"

"ممی! آپ دیکھیں گی کہ میں ابھی اپنی شرارتیں چھوڑ دونگی۔"

یہ کہکر اس نے بڑی سنجیدگی سے دروازہ کا پردہ اٹھایا تاکہ ممی اور صوفیہ دونوں نکل جائیں۔ جب وہ دونوں چلی گئیں تو پیچھے سے زور کا قہقہہ لگا کر بولی۔ "آپ دونوں باتیں کیجئے میں نہیں سن رہی ہوں۔"

ارشد صوفیہ کی طرح زیادہ سوچنے کا عادی نہ تھا۔ نہ وہ فلسفی تھا اور نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ فلسفی بن سکے۔ دن بھر دوستوں سے ملنے، پولو، ریس اور سنیما، شکار وغیرہ میں گذر جاتا۔ شام کو اکثر حصہ انیسہ کے ساتھ گزرتا۔ اس کو رسالہ وغیرہ پڑھنے کیلئے بھی مشکل سے وقت ملتا۔ پھر وہ فلسفی کیسے بن سکتا تھا۔

لیکن اس شام وہ آرام کرسی پر لیٹا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی نظریں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ گویا وہ اسے پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن حقیقت میں اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا "پاپا بالکل راضی

ہیں۔ آج انیسہ کی ممی بات کرنے آئی ہونگی۔ میرے سب دوست خوش ہیں۔ ہوں
کلب میں سب اس حسین انتخاب پر مبارکباد دے رہے تھے۔ واقعی شادی
کامیاب ہوگی۔ انیسہ واقعی خوبصورت ہے۔ جب وہ اپنی شرارتی آنکھیں
میری آنکھوں میں ڈال کر ہنستی ہے۔ اور موتی جیسے چمکدار دانت نظر آتے ہیں
تو یہ جی چاہتا ہے اس کو خوب پیار کروں۔ وہ کتنی خوش مذاق ہے ہنس مکھ
ذرا ذرا سی بات پر ہنس دیتی ہے۔ شرارت تو نس نس میں بھری ہوئی ہے۔ شرفت
فقرے چست کرنے کو تیار رہتی ہے۔ میں نے تو اس کی پیشانی پر شکن بھی نہیں دیکھی
ہم دونوں کتنے خوش رہیں گے۔ مجھے سنجیدگی ذرا بھی پسند نہیں۔ اور خاص کر ان
لوگوں میں جنہیں میں پسند کرتا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس
قسم کی سنجیدگی کسی غم کی پردہ دار ہوتی ہے۔ جو مجھے دیکھ کر سنجیدہ بن جاتے ہیں
مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی ان کی اس تکلیف کا جسے وہ سنجیدگی میں چھپانا
چاہتے ہیں ذمہ دار ہوں۔ صوفیہ ہمیشہ ایسی ہی سنجیدہ رہتی ہے۔ نہ معلوم کیوں۔
جب بھی وہ میرے سامنے آتی ہے تو میری ساری شگفتگی ختم ہو جاتی ہے۔ تمام
ماحول پر ایک گہرا سکوت اور خاموش اداسی چھا جاتی ہے۔ وہ شام چاہے کتنی
ہی حسین ہو۔ لیکن مجھے جون کے مہینہ کی تپتی ہوئی گرم دوپہر سے بدتر محسوس ہیں
ہوتی ہے۔ اس کی موجودگی میں مجھے انیسہ سے بھی مذاق کرنے کی ہمت نہیں ہوتی
ممکن ہے کہ اس نے اپنا یہ ناخوشگوار اثر محسوس کیا ہو۔ اور ضرور کیا ہوگا کیونکہ
وہ مجھ سے بغیر نظریں ملائے ہوئے بات کرتی ہے۔ نہ کبھی میری طرف دیکھتی اور
نہ کبھی رخصت ہوتے وقت ہاتھ ملاتی ہے۔ اور کوئی بات پوچھو تو مختصر سے مختصر

الفاظ میں جواب دیتی ہے۔ شاید اس نے میری نفرت کا احساس کیا ہوگا اور ممکن ہے اپنی کچھ توہین بھی محسوس کی ہو ——"

انیسہ تو بہت ہنس مکھ اور شرارتی ہے۔ اس کی تو رگ رگ میں بجلیاں ٹوٹتی ہیں۔ سنجیدگی تو درکنار وہ کبھی سوچ سمجھ کر بات تک نہیں کرتی۔ ہمیشہ مذاق، اودھم اور فقرے بازی۔ وہ مجھ سے یقینی محبت کرتی ہے۔ لیکن دیوانہ وار نہیں! ورنہ میں شادی سے پہلے دیوانہ وار محبت کا قائل بھی نہیں۔ میں تو دو باتوں کا قائل ہوں ایک یہ کہ لڑکے اور لڑکی کو بالکل ایک سی طبیعت کا ہونا چاہئے۔ ذرا بھی اختلاف نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ شادی سے پہلے محبت دیوانہ وار نہ ہو۔ ہم دونوں کیساتھ بالکل یہی معاملہ ہے۔ ہم دونوں یقیناً بہت خوش رہیں گے۔ شادی کے بعد ہم سیاحت کو جائیں گے۔ تمام دلچسپ مقامات کی سیر کریں گے۔ تین مہینہ تک مگر نہیں تین مہینہ تو کم ہونگے۔ کم سے کم چار مہینہ تک۔ اچھا ہے کچھ دن انیسہ صوفیہ سے الگ رہے مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں صوفیہ اسے بھی سنجیدہ اور خشک نہ بنا دے۔

مگر میں پوچھتا ہوں آخر صوفیہ اتنی سنجیدہ کیوں ہے؟ اس کی عمر مشکل سے بیس برس کی ہو گی۔ اس عمر میں بوڑھوں کے سے انداز۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی آنکھیں انیسہ سے بہتر ہیں۔ وہ بالکل ایک ملکہ کی طرح ہے۔ لیکن مغموم۔ میرے خیال میں اگر وہ ایسے ہی رہی تو شاید کوئی اس سے شادی کرنا پسند نہ کرے۔ اس کی اس سنجیدگی میں کوئی راز ہے۔ رازِ محبت ممکن ہے۔ میں اس راز کے معلوم کرنے کی کوشش کرونگا۔ انیسہ سے پوچھوں گا۔ جب ہم

دونوں الگ ہونگے۔ انیسہ کو چاکلیٹ کتنے پسند ہیں۔ اس کے احمریں لبوں میں وہ کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض وقت تو وہ بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ ایک دن کہہ رہی تھی کہ مجھے بادل گرجنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب بادل گرجتا ہے تو فوراً کمرے میں جا کر تکیوں میں اپنا منہ چھپا لیتی ہوں کیسی بچوں کی سی بات ہے۔ مگر اس کی یہ باتیں کتنی اچھی معلوم ہوتی ہیں بعض وقت اس کی باتوں پر صوفیہ بھی مسکرا دیتی ہے۔ اس کے حسین چہرے کو یہ مسکراہٹ کس قدر درخشاں بنا دیتی ہے۔ وہ کتنی خوبصورت معلوم ہوتی ہے اُس وقت۔"

کتاب اس کے گھٹنوں پر گر پڑی۔ آواز پر چونکا۔ ادھر اُدھر دیکھا اور پھر کھو گیا ———

شفق کی سرخی آسمان پہ پھیلی ہوئی تھی۔ صوفیہ دریچہ میں سے جو سڑک کی طرف کھلتا تھا بازار کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بمبئی کے خاص بازاروں میں بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ موٹروں اور سواریوں کی ایک مسلسل قطار چلی جاتی ہے۔ صوفیہ نیچے کسی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم اس کے چہرے پہ ہلکی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے اور ذرا نیچے جھک کر دیکھا۔ اب اس کے چہرے کی شگفتگی غائب ہو گئی۔ وہ پھر کمرے میں آ گئی۔ اتنے میں انیسہ اُچھلتی کودتی داخل ہوئی۔

"کیا کر رہی ہیں آپ۔ پڑھ رہی ہونگی۔"

"ہاں پڑھ رہی ہوں۔"

"اس وقت پڑھائی! کھڑکی میں سے سڑک کا تماشہ بھی نہیں دیکھا؟"
"ہاں دیکھا ہے۔"
"میں شام سے درزی کا انتظار کر رہی ہوں۔ آج بادامی لباس لانے کا وعدہ کیا تھا اس نے۔ اسی لیئے میں نے کل ارشد سے کہا تھا کہ تم بھی اپنا بادامی سوٹ پہن کر ساڑھے چھ کے قریب یہاں آنا میں دروازے پہ ہی ملونگی۔ وہ بیچارا شاید آیا ہو۔"
"ارشد ابھی یہاں سے گذرا ہے۔ بادامی سوٹ ہی میں تھا۔"
"اچھا آپنے بھی دیکھا تھا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آپ کتاب سے ہی چمٹی رہیں۔"
"میں اس دریچہ میں ہی کھڑی تھی۔"
"اور آپ نے ارشد کو پہچان بھی لیا — حالانکہ آپنے کبھی اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا ہو گا۔ اس نے دیکھا ہو گا آپ کو؟"
"ہاں ہاں"
"اور سلام بھی کیا ہو گا۔ آپ نے جواب دیا؟"
"نا"

"کیوں؟ یہ بہت برا کیا آپ نے۔ کم سے کم اخلاقاً مسکرانا ہی چاہیئے تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ آخر آپ اس قدر الگ کیوں رہتی ہیں۔ ہر وقت سنجیدہ خاموش۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھ سے زیادہ تیز، بااخلاق اور خوش سلیقہ ہیں، لیکن نہ معلوم کیوں ان خصوصیات کو چھپائے رکھتی ہیں۔ وہ یہ سب باتیں بہت دلچسپی سے سنتا رہا پھر آخر میں کہنے لگا کہ آخر وہ مجھ سے نفرت کیوں

کرتی ہیں؟

"نفرت!"

"ہاں اُس نے بھی پُوچھا تھا مجھ سے۔ اور آپ جانتی ہیں کہ وُہ غلط نہیں کہتا۔ آخر آپ اپنا برتاؤ دیکھئے۔ اُس سے کس طریقہ سے ملتی ہیں۔ اگر وہ یہ خیال نہ کرے تو اور کیا کرے۔ لیکن میں نے اس کی اس بات کی بھی تردید کر دی اور کہا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ تمہاری اکثر تعریف کرتی ہیں۔"

"انیسہ!"

"میں جانتی ہُوں کہ یہ سب غلط ہے۔ لیکن آپ کا کس قدر خیال کرتا ہے اور آپ اس کے ساتھ بالکل اجنبی کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ آپ خُود بتائیے یہ کس قدر نامناسب ہے۔"

صُوفیہ نے بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے انیسہ کی گردن میں باہیں ڈال دیں اور اسے کھینچ کر پیار کیا۔

انیسہ بولی۔ "آخر آپ بھی ارشد کا تھوڑا بہت خیال کیوں نہیں رکھتیں؟"

صُوفیہ نے اور کھینچتے ہُوئے پیشانی پر بوسہ دیا۔ انیسہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ ٹہلنے نہیں چلیں گی؟"

"نہیں میرے سر میں اس وقت درد ہو رہا ہے تم اور ممی چلے جاؤ۔"

"میں اور ممی تو خیر چلے ہی جائیں گے۔"

"ارشد جا رہا ہے تمہارے ساتھ۔"

"نہیں۔ اُس کے کلب میں آج جلسہ ہے۔ وہ وہاں گیا ہو گا۔"

صوفیہ اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئی۔ اس کو تنہائی ہی پسند تھی۔ کرسی پر وہ نیم دراز ہو گئی۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے لگا ہوا تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔

سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سے وہ چونک گئی۔ ارشد کمرے میں داخل ہوا۔ صوفیہ کو دیکھ کر کچھ ٹھٹکا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ باقی لوگ دوسرے کمرے میں ہی ہونگے۔ آگے بڑھا اور بولا۔

"مزاج بخیر؟"

"جی ہاں شکر ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ اس مختصر جواب کے بعد وہ کیا کہتا۔ یہ صوفیہ کتنی خشک مزاج واقع ہوئی ہے۔ وہ سوچنے لگا۔

دونوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ پہ بیٹھ گئے۔

"ممی اچھی طرح ہیں؟"

"جی ہاں بخیریت ہیں۔"

"اور انیسہ"

"وہ بھی اچھی ہے۔"

کتنے مختصر جواب دے رہی ہے۔ ارشد نے سوچا کچھ دیر سلسلہ گفتگو رکھا جائے۔

"انیسہ کہیں گئی ہیں؟"

"وہ ممی کے ساتھ ٹہلنے گئی ہیں۔" صوفیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

ارشد نے سوچا کہ شاید صوفیہ کو اس کی موجودگی کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ ہے یہ سوچ کر اس نے جانا چاہا۔ لیکن نہ معلوم کیوں وہ نہ اٹھ سکا۔

"ہمارے کلب کے ممبر نہیں آئے تھے اس لئے جلسہ ملتوی ہو گیا۔"

"انیسہ کو خبر نہیں۔ اسی لئے وہ چلی گئی۔"

"آپ نہیں گئیں؟"

"مجھے کچھ ٹہلنے کا زیادہ شوق نہیں ہے۔"

"غالباً کتابوں کو آپ ترجیح دیتی ہیں۔"

"یقیناً" "کتابیں اس طرح وقت ضائع کرنے سے کہیں بہتر ہیں۔ آپ خود بتائیے ارشد صاحب! کتابوں سے آدمی بہرحال تجربہ لیاقت معلومات بڑھا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح وقت ضائع کرنے سے کیا نتیجہ۔"

صوفیہ کی سرد مہری اب ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی بھی شگفتگی سے بدل چکی تھی۔ دو ایک دفعہ ارشد کی طرف دیکھ کر مسکرائی بھی۔ ارشد اس تبدیلی پر بہت مسرور ہوا۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے باتیں کرنے میں کئی مرتبہ دونوں کی نظریں بھی ملیں۔ صوفیہ اب اس سے بالکل اس طرح بات کر رہی تھی جیسے ایک دوست سے کرنی چاہئیں۔ دونوں کافی بے تکلفی محسوس کرنے لگے۔ جب ارشد جانے لگا تو دونوں نے ہاتھ ملائے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ارشد چلا گیا۔

ارشد صوفیہ کے سامنے جتنا مسرور تھا زینہ سے اترتے ہی اس پر اتنی ہی اداسی چھا گئی۔ ایک عجیب طرح کی افسردگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ صوفیہ

انیسہ اور اپنے بارے میں کیا سوچے۔

صوفیہ خوش تھی۔ بہت خوش۔ اتنی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ رونے لگی اور دیر تک روتی رہی۔

تین مہینے گذر گئے تھے۔ انیسہ برابر اپنی شادی کو ٹالتی ہی رہی۔ جب اس کی ممی اصرار کرتیں تو وہ کہدیتی کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ ذرا ٹھہرئیے۔ اب وہ معاملات کو سمجھ رہی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح گاتی بجاتی اودھم مچاتی، صوفیہ کو تنگ کرنے کیلئے طرح طرح کی حرکتیں کرتی۔ لیکن جب وہ ارشد کا ذکر کرتی تو صوفیہ اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی اور بڑی دلچسپی سے اس کی بات سنتی۔ انیسہ نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ ارشد میں بھی اب تبدیلی ہو چکی تھی۔ اب وہ ویسا چھچھورا اور شرارتی نہیں تھا۔ اس میں سنجیدگی آچکی تھی۔ اکثر گہری سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا۔ باتیں بھی بہت مختصر کرتا۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس حالت پر قابو پالیتا اور وہی ارشد بن جاتا لیکن بہت تھوڑی سی دیر کے لیئے۔ اسکی آنکھوں سے اس کے اندرونی غم و فکر کا اظہار ہوتا تھا۔

صوفیہ بھی بدل چکی تھی۔ صوفیہ جو کبھی کبھی بے اختیار انیسہ سے لپٹ جاتی تھی اور اس کو پیار کرتی تھی۔ اب گھنٹوں اس سے بات بھی نہ کرتی۔ بلکہ اکثر اس سے دور رہنا چاہتی۔ جب وہ انیسہ کو دیکھتی تو ایک دم اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ جاتی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی۔ رات کو دیر تک جاگتی رہتی۔ اکثر انیسہ دبے پاؤں اس کے کمرے کے قریب جا کر سنتی تو وہ یا تو کروٹیں بدلتی ہوتی یا روتی ہوتی۔

جب صوفیہ اور ارشد ملتے تو یہ حالت اور نمایاں ہو جاتی اور یہ تقریباً روزانہ ہی ہوتا۔ دونوں کم گفتگو کرتے۔ جواب بہت مختصر اور اکثر مبہم سے ہوتے لیکن دونوں ایک دوسرے کو اکثر دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھی تو تمام دن دونوں میں کچھ بھی گفتگو نہ ہوتی۔ دونوں ایک دوسرے سے ذرا دور ہی رہتے۔ لیکن صوفیہ جس چیز کو چھوتی تو ارشد ضرور کسی نہ کسی بہانے سے اس چیز کو اٹھا لیتا۔ جب کبھی صوفیہ کو آنے میں ذرا دیر ہوتی تو ارشد بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھتا رہتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ صوفیہ کے آنے کے چند منٹ بعد ہی وہ اجازت لیکر چلا جاتا۔ صوفیہ بھی پہلے سے پیلی ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ اکثر وہ اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔ نہ باہر نکلتی اور نہ کسی سے ملتی۔

ایک شام کو انیسہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

"مہربانی کر کے آپ ذرا تکلیف گوارا کریں گی؟"

"کیا بات ہے؟"

"ارشد باہر چبوترے پر اکیلا ہے۔ میں ذرا خط لکھنا چاہتی ہوں آپ مہربانی کر کے ذرا اس کے پاس چلی جائیے۔"

"لیکن ——"

"میری خاطر ذرا سی تکلیف۔"

"لیکن تم کب آؤ گی؟"

"مجھے دو لائنیں لکھنی ہیں ابھی آتی ہوں۔"

صوفیہ باہر چبوترے کی طرف چلی۔ ارشد وہاں ٹہل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ

وہ وہاں آئی۔

"انیسہ نے مجھے بھیجا ہے۔"

"آپ کو زبردستی آنا پڑا؟"

"زبردستی۔ نہیں تو۔"

اُس کا چہرہ اُتر گیا اور بدن نہ معلوم کیوں کپکپانے لگا۔ ارشد اُس کے قریب ہی تھا۔

"کیا بات ہے صوفیہ؟"

"کچھ نہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے صوفیہ" اُس نے ہمت کر کے کہا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"ارشد کیا کہہ رہے ہو ذرا سوچو تو۔ اگر انیسہ سن لے تو۔"

"میں انیسہ سے محبت نہیں کرتا صوفیہ! مجھے تم سے محبت ہے۔"

"لیکن یہ دھوکا دینا ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"اچھا!" انیسہ دروازے میں سے دیکھ کر مسکرائی۔ "دونوں میں صلح ہو گئی۔"

انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ صوفیہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے وہاں سے چلی گئی ـــــ ارشد ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

"کیا ہوا ارشد؟" انیسہ بولی

"کچھ نہیں میں جا رہا ہوں۔"

بغیر انیسہ سے رخصت ہوئے وہ چلا گیا۔ انیسہ اس کو دیر تک دیکھتی رہی اور پھر دیر تک سوچتی رہی وہیں کھڑی۔

"اوہو! یہ بات ہے۔ اب میں سمجھی۔"

ایک دن انیسہ سے ممی نے جب شادی کے متعلق پوچھا تو وہ بولی "میں ارشد سے شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"نہ مجھے اس سے محبت ہے اور نہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور پھر تم دونوں وعدہ بھی تو کر چکے ہو۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"لیکن لوگ کیا کہیں گے؟"

"یہ مسٹر لوگ کون صاحب ہیں میں ان سے واقف نہیں۔"

"تم اپنی شرارتیں نہیں چھوڑو گی۔ لیکن آخر ارشد سے کیا کہا جائیگا۔"

"کیوں کہنے کو کیا ہوا۔ آپ کہہ دیجئے گا کہ وہ بہت شرارتی ہے۔ بدتمیز ہے ممکن ہے آئندہ واقعات اور تلخ ہو جائیں۔ پھر آپ اپا کے ساتھ......"

"اپا۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ تمہیں دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا۔"

"ہاں ہاں مس صوفیہ کے ساتھ۔ اب تک وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ رہے ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کے مزاج سے بالکل ناواقف ہیں لیکن

مجھے یقین ہے کہ شادی کے بعد وہ بہت خوش رہیں گے اور پھر یہی مناسب بھی ہوگا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے یقین نہیں کہ ارشد مان جائے ممکن ہے اُس کی والدہ ناراض ہو جائیں۔"

"نہیں نہیں۔ آپ بالکل اطمینان رکھئے۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا ہوگا کہیں بغیر محبت کئے ہوئے شادی نہیں کر سکتی۔ اس میں ناراضگی کی کوئی وجہ ہی نہیں۔"

"لیکن صوفیہ کے متعلق شک ہے۔"

"کچھ شک کی بات نہیں۔ آپ اس چیز کو اُن پر چھوڑ دیجئے۔ وقت گذرنے پر سب کام اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"اچھا دیکھو کیا ہوتا ہے۔ تم اب جاؤ سو رہو۔"

جب انیسہ چلی گئی تو ممی نے سوچا کہ انیسہ ٹھیک کہتی ہے۔ صوفیہ اور ارشد کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"اب معاملہ ٹھیک ہوا۔" انیسہ نے سوچا ممی کے ساتھ کیا چال چلنا پڑی مجھے "اب سب باتیں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" وہ صوفیہ کے کمرے کی طرف گئی۔ کمرہ بند تھا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ وہ بدستور کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور ایک سسکیوں کی بھی آواز آئی۔

"اچھا! اچھا!! اب تم آرام سے سو جاؤ۔ میں نے سب باتیں ٹھیک کر دی ہیں۔ تم کچھ فکر نہ کرو۔"

اُس نے آہستہ سے کہا اور پھر اپنے کمرے میں آ کر سو گئی۔

وقت حقیقت میں بڑا کارساز ہے۔ وہی ہؤا جو انیسہ نے سوچا تھا۔ آخر ایک دن وہ سنہری شام بھی آہی گئی جب انیسہ نے صوفیہ سے پُوچھا کہ آپ اپنی شادی پر مجھے کیا تحفہ دینگی۔ ارشد بھی بیٹھا تھا۔ اُس نے ارشد سے کہا کہ مجھے میرے لیے بہت سی چاکلیٹ لانا نہ بھول جائیے گا۔ ارشد اور صوفیہ اس کی باتیں سُن کر ہنس دیئے "میرا ہمیشہ سے خیال ہے"۔ ارشد اسی شام کو اپنے ایک دوست سے بولا۔ لڑکے اور لڑکی کو ہمیشہ مختلف طبیعتوں کا ہونا چاہیئے تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ ایک دُوسرے کی خاطر اپنی عادات و اطوار میں تبدیلی کر سکیں۔ تھوڑی قربانی ہی کر سکیں۔ دونوں کو کبھی بالکل ایک سی طبیعت کا نہ ہونا چاہیئے۔ ایک سی طبیعت والے تو دو متوازی لائینوں کی طرح ہوتے ہیں جو بالکل آمنے سامنے ہوتی ہیں لیکن کبھی ایک دُوسرے سے نہیں ملتیں ⁂

آخری کھیل

(۱)

ریفری نے سیٹی بجائی۔ سب کھلاڑی رُک گئے۔ عین موقع پر جب گول ہونے ہی والا تھا تو تارا کلب والوں نے "فاؤل" کر دیا۔ "بولی" ہوئی۔ جیمی کی ہاکی ذرا اٹھی اور گیند سنسناتی ہوئی گول میں گھس گئی۔ ایک گول ہو گیا اور کھیل پھر ہونے لگا۔ تارا کلب والے کالج کے مقابلے میں ٹیم لیکر آئے تھے لیکن کالج سے جیتنا کارے دارد۔۔۔ کالج ہی پہ کیا منحصر تھا جس طرف بھی جیمی کھیلتا ہو اس سے میچ جیتنا ناممکن تھا۔ گیند اس کے پاس آئی اور بس گول میں گئی۔ ایسی پھرتی سے گیند نچاتا ہوا لے جاتا کہ کسی کی نظر ہی اس پہ نہ ٹھہرتی۔ جب وہ گیند کو ہاکی پہ اچھالتا ہوا مخالفوں سے بچتا تیزی سے گول کی طرف بڑھتا تو تماشائیوں کی نگاہیں بے اختیار اس پر جم جاتیں پھر جب وہ گیند کو آہستہ سے اچھال کر زور کا ہٹ لگاتا اور گیند گول کے پار ہو جاتی تو بے اختیار ہیرہیر کا نعرہ نکل جاتا۔

سچ تو ہے کہ وہ کھیلتا بھی ایسا ہی تھا۔ شہر تو کیا تمام صوبہ بلکہ ملک میں بھی اس سے بہتر کھیلنے والا اور اس سے زور کا ہٹ لگانے والا کوئی نہ تھا۔ کئی مرتبہ ملک کی منتخب ٹیموں میں کھیل چکا تھا۔ نہ معلوم اس کے کھیل میں کیا کشش تھی کہ جب بھی معلوم ہوتا کہ آج جیمی کھیلے گا تو تمام شہر امنڈ پڑتا۔ کھیل کے میدان میں

آدمی ہی آدمی نظر آتے اور سب کی نظریں اسی کی طرف لگی رہتیں۔ مخالفوں کے حوصلے پست ہو جاتے۔ وہ ان کی ٹانگوں کے نیچے اور ہاکیوں کے اوپر سے گیند ایسی پھرتی سے لے جاتا کہ وہ دیکھتے اور بھاگتے ہی رہ جاتے اور ادھر گول بھی ہو جاتا۔ کھیلتے کھیلتے اس کو پسینہ آجاتا۔ گلابی چہرہ سرخ ہو جاتا۔ سیاہ گھونگھر والے بال اس کی روشن پیشانی پر بکھر جاتے اور وہ خود اپنے کھیل کو اور بھی حسین بنا دیتا۔ تماشائی حیرت سے دیکھتے ہی رہتے کہ اس دبلے پتلے کمزور سے لڑکے میں بجلی کی سی پھرتی اور ہٹ لگانے کی طاقت کہاں سے آجاتی ہے۔ کچھ تو حیرت سے اسی کو تکا کرتے اور کچھ گیند پر نظریں جمانے کی کوشش کرتے جو کبھی مدھم اور باریک تارے کی طرح غور سے دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتی۔

جیمی نے لگاتار چار گول کیے۔ کھیل کا میدان تالیوں اور ہپ ہپ ہرے کے نعروں سے گونج اٹھتا۔ ریفری نے پھر سیٹی بجائی اور کھیل ختم ہو گیا۔

(۲)

پالٹکس کا گھنٹہ ختم ہوا۔ کلاس سے لڑکے اور لڑکیاں نکلیں۔ کچھ دوسرے کلاس میں چلے گئے اور کچھ لائبریری کی طرف جیمی سب سے آخیر میں نکلا۔ بملا اس کے انتظار میں ابھی وہیں کھڑی تھی۔

بملا۔ میں نے سنا ہے کل آپ بہت اچھے کھیلے۔ مبارک ہو۔

جیمی۔ آپ نے صرف سنا ہی یا دیکھا بھی؟

بملا۔ میرا ارادہ تو پکا تھا اور نینا سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ ساتھ چلوں گی مگر اس وقت ضروری کام نکل آیا اور نہ جا سکی۔

جیمی۔ جی ہاں! آپ کے یہ ضروری کام ہمیشہ ایسے ہی وقت نکلتے ہیں۔

بملا۔ آپ کو کیا معلوم مجھے اس کا کتنا افسوس ہے۔ صرف میں نے ہی آپ کا کھیل نہیں دیکھا۔ ہر دفعہ پکا ارادہ کر لیتی ہوں مگر یہ کمبخت کام ایسے اٹک جاتے ہیں کہ یوں ہی رہ جاتی ہوں۔

جیمی۔ اوہو معاف کیجئے گا۔ میں مبارکباد کا شکریہ تو ادا کرنا بھول ہی گیا۔

بملا۔ بس رہنے دیجئے اپنے شکریہ کو۔ یہ تو بتاتے نہیں کہ آج میچ ہوگا اور اُلٹی شکایت کرتے ہیں۔

جیمی۔ شکایت کس نے کی ہے۔ جب آپ کو خود ہی میچ کا علم ہو جاتا ہے تو اطلاع کی کیا ضرورت ہے۔

بملا۔ واہ بتایا کیجئے۔ پچھلے میچ کی تو مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ اگلے دن نینا نے بتایا کہ آپ کھیلے تھے اور.......

جیمی۔ تو کیا نینا ہر میچ میں جاتی ہیں؟

بملا۔ نینا ہی کا کیا ہے۔ کالج کی تمام لڑکیاں جاتی ہیں۔ مجھے اسی کا تو افسوس ہے کہ میرے سوا سبھی نے آپ کا میچ دیکھا ہے کل تو شاید ہوسٹل کی وارڈن بھی گئی تھیں۔ آپ کے کھیل کی بڑی تعریف کرتی تھیں۔

جیمی۔ اچھا مس دلیپ بھی گئی تھیں۔ مگر میں نے تو انہیں نہیں دیکھا۔

بملا۔ کھیل میں خیال نہ کیا ہوگا۔ اچھا دیکھئے اب کی میچ ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔

جیمی (مسکراتے ہوئے) تاکہ آپ پہلے سے کوئی ضروری کام سوچ لیں۔ بملا شرما کر خاموش ہو گئی۔

انگریزی کا گھنٹہ تھا۔ نینا اور بملا پاس پاس بیٹھی تھیں۔ سامنے جیمی بیٹھا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب بورڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ سب لڑکے اس کی نقل کر رہے تھے بملا بھی لکھ رہی تھی لیکن بار بار جیمی کی طرف دیکھ لیتی۔ جیمی نے بھی لکھتے لکھتے اس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملیں ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی۔ نینا نے دیکھ لیا۔ بملا نے جلدی سے سر جھکا لیا اور لکھنے لگی۔ نینا آہستہ سے بملا کے کان میں بولی۔

"چور"

"کیا چرایا میں نے؟" بملا نے بورڈ پر سے نقل کرتے ہوئے کہا۔

"نظریں" نینا نے آہستہ سے کہا اور اپنی پنسل کی باریک نوک بملا کی کلائی میں چبھو دی۔ بملا اچھل پڑی

"شریر"۔ اس نے پنسل کے باریک نشان کو کلائی پر سے مسلتے ہوئے کہا۔

"کہدونگی پروفیسر صاحب سے"

"پروفیسر صاحب سے کیوں کہتی ہو۔ جیمی سے کہدو۔" نینا نے کہا اور پھر پنسل کی نوک اس کے بازو میں چبھو دی۔

"ہنہو بدتمیز" بملا نے اپنی چھوٹی سی سیٹ پر اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو نشان پڑ گیا۔ کیسے زور سے گھسائی ہے نوک!"

"اوں ہوں" نینا نے بملا کے مرمریں بازو پر پنسل کا باریک نشان دیکھ کر کہا۔ "کیسا پیارا معلوم ہو رہا ہے۔ تھوا میری جگہ جیمی ورنہ......"

بملا نے بغیر اس کی بات پوری سنتے ہوئے اس کی ران میں باریک سی چٹکی لی

اور نینا اپنے ڈیسک پر اچھل پڑی اور پروفیسر صاحب کی نظر سے بچنے کے یئے ویسے ہی کاغذ پر پنسل چلانے لگی۔

گھنٹہ بجا۔ سب کلاس سے نکلے۔ بملا اور نینا ساتھ نکلیں۔ جیمی بملا کی طرف بڑھا۔ نینا اس کو دیکھ کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔

جیمی۔ کل شام کو ہے ہمارا میچ۔

بملا۔ کس سے؟

جیمی۔ امریکن بٹالین سے ہے۔ آیئے گا نا آپ؟

بملا۔ کیوں نہیں ضرور آؤنگی۔

جیمی (مسکراتے ہوئے) اور کوئی ضروری کام نکل آیا تو؟

بملا۔ واہ ضروری کام کیسے نکل آئے گا۔ اور اس سے زیادہ ضروری کام اور کیا ہو سکتا ہے۔

جیمی۔ تو پھر آپ وعدہ کرتی ہیں، ضرور آئیں گی۔

بملا۔ یقیناً آؤنگی (شرارت سے مسکرا کر) دیکھوں گی کیسا کھیلتے ہیں آپ؟

جیمی۔ میں تو خیر جیسا کھیلتا ہوں آپ کو معلوم ہی ہے۔ مگر آپ آئیں گی بھی یا ویسے ہی.......

بملا۔ لیجئے اب وعدہ تو کر رہی ہوں اور کیا......

جیمی۔ آپ کے وعدے کا تو مجھے پورا یقین ہے۔ لیکن ان ضروری کاموں سے البتہ اندیشہ ہے۔

بملا۔ واہ آپ تو بیکار میں بناتے ہیں۔

جب جیمی چلا گیا تو نینا آئی اور بولی۔

"کہو کیا باتیں ہوئیں؟"

"میچ کو کہہ رہے تھے۔" ببلا نے کہا۔

"کب ہے؟"

"کل"

"چلوگی تم؟"

"ہاں ہاں ضرور"

"بس تم اپنی ہاں ہاں کو تو رہنے دو۔ جیمی کو ہو تو ہو مجھے تو تمہارا بالکل اعتبار نہیں ہے۔ پچھلی دفعہ بھی وعدہ کر لیا۔ ہم تو ہوسٹل میں اتنی دیر تک انتظار کرتے رہے اور وہ اپنے گھر ہی سے نہیں نکلیں۔"

"کیا بتاؤں نینا! ایک ایسا کام لگ گیا کہ بہتیرا چاہا کہ کمبخت کسی صورت سے ختم ہو جائے مگر وہ پورا ہی نہیں ہوا اور میچ کا وقت نکل گیا۔"

"تو پھر تم ضرور آؤگی شام کو۔ ببلا! تم نے جیمی کو کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا جب کھیلتے ہیں اس کے بال گالوں پر بکھر جاتے ہیں اور وہ جھٹکا دیکر انہیں پیچھے کرتا ہے تو اس قدر پیارا معلوم ہوتا ہے کہ کیا کہوں۔ اور جب کھیلتے کھیلتے اس کا سانس پھول جاتا ہے تو اس کے سینے کا ہلکا سا تموج کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب وہ گیند کے پیچھے بھاگتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شہاب ثاقب ٹوٹ کر گرا۔" نینا نے اپنی کتابیں دوسرے ہاتھ میں لیکر ببلا کی طرف دیکھا۔ ببلا حیرت اور رشک سے نینا کو دیکھ رہی تھی۔ نینا نے ببلا کی نظروں سے دل کا حال جان لیا۔ اور بات بدلنے

کو کہنے لگی۔

"تو پھر کل تم آؤگی ضرور۔"

"ہاں ہاں ضرور آؤں گی۔" بملا نے چونک کر کہا۔ "تم میرا انتظار کرنا۔"

"میچ پانچ بجے سے شروع ہوگا۔ پونے پانچ تک تمہارا انتظار کروں گی۔" بنیا نے کہا۔ "تم میرے کمرے میں آجانا۔ پھر چائے پی کر چلیں گے۔"

"اچھا میں ساڑھے چار سے پہلے ہی آجاؤں گی۔"

(۴)

امریکن بٹالین اور کالج کا میچ تھا۔ پھر اس میں جیمی بھی کھیل رہا تھا۔ اور اس سے زیادہ کیا چاہیے تھا کھیل کے میدان میں تماشائیوں کی کوئی انتہا نہ تھی اور برابر چلے آرہے تھے۔ ٹیم سکریٹری کو اسی کا افسوس ہو رہا تھا کہ ناحق آج کے کھیل پر ہیں نے ٹکٹ نہ لگا دیا ورنہ ایک آل انڈیا ٹور کا خرچ تو نکل ہی آتا۔ شامیانے کے نیچے لیڈیز کی نشست تھی۔ ریفری نے سیٹی بجائی اور کھیل شروع ہوا۔ جیمی نے کھیلنے سے پہلے شامیانے کی طرف غور سے دیکھا اور کھیل میں لگ گیا۔ آج اس میں غضب کی پھرتی آگئی تھی۔ لمبے تڑنگے فوجی گوروں کے بیچ میں سے گیند نچاتا ہوا ایسی پھرتی سے لے جاتا کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے اور اس دبلے پتلے لڑکے کی پھرتی پر جھنجھلا اٹھتے۔ کھیل شروع ہوتے ہی جیمی نے ایک گول کر دیا۔ میدان کی فضا تالیوں سے گونج اٹھی جیمی نے امید افزا نظروں سے شامیانے کی طرف دیکھا مگر شاید کچھ نہ دیکھ سکا۔ اور پھر کھیل میں لگ گیا آج جیمی کا کھیل معمول سے بہت زیادہ اچھا تھا۔ تماشائیوں کی نظریں اسی پر جمی ہوئی

نظیں۔ اس کے ساتھی نے گیند اس کو "پاس" کی۔ وہ لیکر آگے بڑھا۔ ایک فوجی اس پر لپکا۔ اس نے آہستہ سے گیند اس کی ٹانگوں میں سے کھسکا دی تماشائیوں نے قہقہے لگائے۔ وہ جھنجھلا کے رہ گیا۔ جیمی اتنے میں گول کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس نے زور کا ہٹ لگایا۔ گیند فوجی گول کیپر کی ہاکی پر لگتی ہوئی گول میں گھس گئی۔

فوجی کاہا جھنجھلا اٹھا۔ وہ اس دبلے پتلے لڑکے کی طاقت کا اندازہ کر کے حیرت میں رہ گیا۔ ادھر جیمی نے اپنی پوری طاقت سے ہٹ لگایا تھا۔ اس کو اپنے بازوؤں میں کچھ سختی سی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی جھکی بھی انگلیاں خود بخود کھل گئیں اور ہاکی چھوٹ پڑی۔ تماشائیوں نے اس کو حیرت سے دیکھا مگر محض اتفاق سمجھا۔ اس کو خود بھی تعجب ہوا۔ جلدی جلدی اپنے دونوں بازو زور سے رگڑے۔ چند لمحوں میں تکلیف خود بخود رفع ہو گئی۔ پے در پے اس نے کئی گول کئے اور اسی شدت سے ہٹ لگائے۔ فوجیوں سے ایک بھی گول نہ ہو سکا۔ وہ اپنی اس ناکامی پر بل ہی کھاتے رہے اور میچ ختم ہونے کی سیٹی بھی بج گئی۔

کالج کے لڑکوں نے بڑھ کر جیمی کو کندھوں پر اٹھا لیا اور ہیئر ہیئر کے نعرے لگائے۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ آج جیمی بہت ہی زیادہ اچھا کھیلا ہے خود جیمی کو بھی حیرت تھی کہ ایسا اچھا کیسے کھیل سکا۔

گھر لوٹتے لوٹتے رات ہو گئی۔ وہ کھانا کھا کر فوراً ہی بستر پر لیٹ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ببلا تو ضرور آئی ہو گی۔ مگر نظر نہیں آئی۔ نینا پر تو نظر پڑی تھی لیکن اتنے

آدمیوں میں ممکن ہے کہیں اور ہو۔ بہر حال وہ آئی تو ضرور ہوگی میچ کو دیکھ کر اس نے میرے کھیل کے متعلق کیا سوچا ہوگا۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بہت بیچین تھا۔ خیر صبح کو کالج میں معلوم ہو جائے گا۔ اس کو اپنے بازوؤں میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہؤا اور ساتھ ہی میچ والی بات بھی یاد آئی۔ اس نے اپنے بازوؤں کو آہستہ آہستہ سہلایا۔ اور پھر دبایا۔ اوفوہ کس قدر سخت ہو رہے ہیں اس کے بازو۔ ہیں۔ بالکل لوہے کی طرح، مگر اتنے سخت کیوں ہیں۔ "صبح کو ڈاکٹر کے پاس جاؤنگا۔" اس نے اپنے آپ ہی سوچا مگر بازوؤں میں درد اور چمک بڑھنے لگی۔ بڑی دیر تک بیچین رہا۔ نیند نہ آئی مگر تھکا ہؤا تھا اس لیئے درد کے باوجود بھی نیند کی آغوش میں کھو گیا۔

(۵)

کالج شروع ہونے میں دیر تھی۔ بملا ذرا جلدی آگئی تھی۔ اُس نے سوچا چلو نینا کے پاس ہوسٹل چلیں۔ نینا جو شاید اس کی فکر میں ہی تھی دیکھتے ہی بولی "چلو یہاں سے جھوٹی زمانہ بھر کی۔ کل پانچ بجے تک انتظار کیا۔ چاء الگ پھنکتی رہی۔ میچ کو الگ دیر ہوئی۔ اور بیگم صاحبہ گھر تک سے نہیں نکلیں۔"

"میری تو سنو، تم تو صبح ہی صبح جھپٹ پڑیں۔۔۔۔۔۔"

"بس رہنے دیجئے آپ اپنی تو۔۔۔۔۔" نینا طنز سے بولی۔ "کہہ دو کوئی ضروری کام تھا!"

"اوہو، میری تو سنو!" بملا نے اُداس لہجہ میں کہا۔ "تمہیں کیا معلوم یہاں کیا گذرتی ہے۔ تم تو ہوسٹل میں بڑے مزے کرتی ہو۔ چھوٹے بھائی کو زور کا بخار

چڑھ آیا اور وہ میرے سوا کسی کے پاس جاتا نہیں۔ بس اسی میں لگی رہی۔
کیا بتاؤں نینا کل مجھے کتنا افسوس ہؤا ہے۔" بملا نے نینا کے گلے میں باہیں
ڈالتے ہوئے پژمردہ لہجہ میں کہا۔" بخار کو بھی بس کل ہی آنا رہ گیا تھا۔ایسا جی
تلملایا ہے کہ کیا بتاؤں جیمی کیا خیال کرتا ہوگا۔"

"بملا میں تم سے کیا کہوں کل جیمی کتنا اچھا کھیلا ہے۔میرے خیال میں تو
وہ ایسا اچھا کبھی کھیلا نہیں اور شاید آئندہ بھی نہ کھیل سکے۔" نینا نے کہا۔ کل
اس نے گوروں کو ایسا نچایا ہے کہ طبیعت خوش ہوگئی ہوگی ان کی۔ ایک گول بھی
نہیں کرنے دیا بیچاروں کو۔ وہ دیکھو ناہید آگئی۔ اس سے پوچھو۔" کیوں ناہید
کل جیمی کیسا کھیلا تھا؟" نینا نے پوچھا۔

"ایسا لاجواب کھیلا کہ کیا بتاؤں۔ میں نے تو اتنا عمدہ کھیلتے ہوئے نہیں
دیکھا۔ ویسے تو وہ جب بھی کھیلتا ہے۔ نہایت اعلیٰ کھیلتا ہے مگر کل تو اس
کا کھیل کمال کا تھا۔" ناہید نے کہا۔" کیوں بملا تم نہیں آئیں کل۔ ہم نے چاء پر
انتظار بھی کیا۔"

"اب کیا بتاؤں تمہیں ناہید"۔ بملا نے کہا۔" بس یوں سمجھ لو کہ......"

"ضروری کام تھا۔" نینا نے جلدی سے طنزاً جملہ پورا کر دیا۔

ناہید۔ تم نے تو شاید جیمی کا کھیل دیکھا ہے؟

بملا۔ نہیں کہاں دیکھا ہے۔ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی ہے۔"

ناہید۔ واہ اگر تم نے جیمی کا کھیل نہیں دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا۔ کل کس قدر
تماشائی تھے نینا؟

"ہوتے ہوتے ہی ہیں"۔ نینا بولی۔ "ارے گھنٹہ بج رہا ہے۔ چلو کلاس لیں۔"

(۶)

ہسٹری کا گھنٹہ تھا۔ جیمی اُمید افزا نظروں سے بار بار بملا کی طرف دیکھتا تھا۔ مگر بملا ندامت کی وجہ سے نظریں جُھکا لیتی تھی۔ لیکن اس کی نظر بچا کر دیکھ بھی لیتی جب گھنٹہ ختم ہوُا اور دونوں باہر نکلے تو جیمی نے پوُچھا۔

"کل دیکھا تھا میچ آپ نے؟"

"نہیں —— میں تو کل نہ آسکی"۔ بملا نے اس کے چہرہ سے نظریں ہٹا کر زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا" جیمی نے کہا۔ اس کی آواز میں افسردگی اور لہجہ میں بلا کا طنز تھا۔

"مجھے بے حد شرمندگی ہے۔ کل میں بالکل تیار تھی۔ لیکن ایسی مصیبت ...."

"مصیبت کیوں، ایک ضروری کام کہئے"۔ جیمی نے شوخ آنکھوں سے جن میں اس وقت بلا کی چمک پیدا ہو گئی تھی اس کی طرف دیکھتے ہوُئے کہا۔

"کیا بتاؤں آپ کو میں۔ خواہ مخواہ آپ سے جھُوٹا بننا پڑا۔ چھوٹے بھائی کو زور کا بخار آگیا"۔

"تو بس سارے گھر میں آپ ہی تھیں تیمار داری کے لئے"۔

"نہیں یوں تو سب۔ مگر وہ مجھ سے ہلا ہوُا ہے۔ کسی کے پاس جاتا ہی نہیں بس اسی میں گرفتار رہی۔ مجھے بے حد ندامت ہے۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کو تکلیف ہوُئی۔ مگر آپ سے زیادہ مجھے اس کی تکلیف ہے"۔ بملا نے رُکتے ہوُئے کہا۔ "نا ہید کہہ

رہی تھیں کل آپ کمال کا کھیلے۔"

"آپ کی بلا سے۔" جیمی نے ایسے لہجہ میں کہا جس میں مختلف جذبات کی ملی جلی کیفیات تھیں۔"

"میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ اب آپ جب بھی کھیلیں گے میں ضرور آؤں گی۔ آپ بتائیے گا۔" بملا نے امید افزا نظروں سے جیمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس رہنے دیجئے آپ اپنی معافی کو۔" جیمی لان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کو نہ آنا تھا اس لئے یہ سب باتیں ہیں۔"

"لیجئے آپ یقین نہیں کرتے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ بخار کو بھی بس کل ہی آنا رہ گیا تھا۔ اب بتائیے گا۔ میں ضرور آؤنگی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔"

"بہت بہتر" جیمی نے ایک عجیب انداز سے کہا۔ اور کلاس کی طرف چل دیا۔ بملا اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔

کالج سے لوٹتے ہی جیمی شہر کے مشہور ڈاکٹر ویاس کے پاس گیا۔ جیمی کو شہر میں کون نہیں جانتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی ویاس بولے۔

"ہاں جیمی! خیریت ہے؟ کیسے تکلیف کی؟ کل سنا ہے گوروں کو منہ کی کھانی پڑی!"

"سب آپ کی عنایت ہے" ورنہ میں کیا اور میرا کھیل کیا۔"

"بھئی غضب کا کھیلتے ہو تم۔ میں نے دیکھا ہے تمہارا کھیل۔ مگر یہ تو بتاؤ آج

ادھر کیسے بھول نکلے؟"

"کل میچ میں ڈاکٹر صاحب!" جیمی نے کرسی قریب کرتے ہوئے کہا "ایسا ہوا کہ جب میں نے ہٹ لگایا تو وہ بہت زور کا لگا ......"

"زور کا لگا؟" ڈاکٹر نے بات کاٹی "تم ہٹ ہمیشہ ہی بہت زور کا لگاتے ہو"

"ہاں تو وہ کچھ زیادہ زور سے لگا۔ میرے ہاتھ میں سنسنی سی ہوئی اور بلا کی چھوٹ پڑی۔ میں نے اس وقت تو سہلا لیا اور وہ بات جاتی رہی لیکن سوتے میں بہت درد اور تکلیف رہی اور میں نے دبایا تو بازو سخت معلوم ہوئے" جیمی نے کہا۔

"سخت معلوم ہوئے"۔ ڈاکٹر نے پوچھا "دکھاؤ تو مجھے"

"یہ دیکھئے" جیمی نے آستین اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر نے بازو دبا کر دیکھے واقعی لکڑی کی طرح تھے۔

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے"۔ ڈاکٹر ڈیاس کے منہ سے نکل گیا۔ "ادھر تو آؤ میں ذرا غور سے دیکھوں"۔

ڈاکٹر اس کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور مختلف آلات سے دیکھا اس کے چہرے سے تردد و پریشانی کے آثار نمایاں تھے جیمی دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کس مصیبت میں پڑ گیا۔

"دیکھو جیمی!" ڈاکٹر نے نرم آواز میں کہا "تمہارے پٹھے بیحد سخت ہو گئے ہیں۔ ان سے طاقت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اس لئے خطرناک حد تک سخت پڑ گئے ہیں۔ تم کھیلنا بالکل چھوڑ دو اور ......"

"کھیلنا چھوڑ دوں؟" جیمی نے حیرت سے ڈاکٹر کا منہ تکتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل چھوڑ دو۔" ڈاکٹر اپنے لہجہ میں ذرا زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنی تندرستی اور طاقت سے زیادہ کام کیا ہے۔ تمہارے بازو اس قدر طاقت برداشت نہ کر سکے۔ اس لئے اب یہی بہتر ہے کہ تم ہاکی کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ۔"

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب؟" جیمی نے جیسے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ممکن" ڈاکٹر تیزی سے بولا۔ "سنو جیمی، تم سمجھدار آدمی ہو اس لئے میں تم سے صاف کہتا ہوں کہ تم موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑے ہو۔ کھیل اتنا ضروری نہیں جتنی زندگی۔ زندگی اسی میں ہے کہ تم کھیلنا تو درکنار کوئی ایسا کام بھی نہ کرو جس سے بازوؤں پر زیادہ زور پڑے ورنہ ——— ورنہ" ڈاکٹر نے رکتے ہوئے کہا۔ "تمہارے بازو کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اور ——— اور"

جیمی کے منہ سے ایک ہلکی سی آہ نکل گئی۔ "مگر ڈاکٹر صاحب! ایک دفعہ کی اجازت اور دیدیجئے۔" جیمی نے نہ جانے کس خیال میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

"ایک دفعہ؟" ڈاکٹر نے غصہ سے دہرایا۔ "ایک دفعہ کیا ہوتا ہے۔ اب تم کھیل کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ تم خود چھو کر دیکھو کتنے سخت ہو رہے ہیں تمہارے بازو۔ اب اگر ان پر زور پڑا تو رگیں فوراً پھٹ جائیں گی۔"

"کاش ڈاکٹر صاحب میں کم سے کم ایک دفعہ اور کھیل سکتا۔" جیمی نے حسرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "ایک دفعہ صرف ایک دفعہ اور اپنی زندگی میں۔ ورنہ میرا یہ تمام کھیل، تمام کمال سب بیکار ہو جائے گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو جیمی"؟ ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ "تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو"۔

(۷)

"اب کب ہے آپ کا میچ"؟ بملا نے کلاس سے نکلتے ہوئے جیمی سے کہا۔

"میچ!" جیمی چونک گیا اس کے احساسات کو ٹھوکر سی لگی۔ "میچ تو پرسوں ہی ہے۔ مگر میں نہیں کھیلوں گا"۔

بملا دھک سے رہ گئی اور بولی۔ "کیوں"؟

"ویسے ہی" نہ جانے کیوں جیمی نے اصل وجہ چھپاتے ہوئے کہا۔ "ایک آسٹریلیا کی ٹیم آئی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں سب جگہ کھیل کر اب ہمارے کالج سے میچ پڑا ہے۔ گیم سیکرٹری اور پرنسپل صاحب نے بہت زور دیا مگر میں نے منع کر دیا"۔

"آخر کیوں"؟ بملا بےچینی سے بولی۔ "دیکھئے آپ ضرور کھیلئے۔ فارن ٹیم سے میچ کالج نے صرف آپ کی وجہ سے لیا ہے"۔ اس کی آواز میں ایک التجا تھی۔

"نہیں، میں نہیں کھیل سکوں گا"۔ جیمی نے کہا مگر نہ معلوم کیوں وہ اصل بات نہ بتا سکا۔

"دیکھئے میں ضرور آؤں گی آپ......"

"تو آئیے گا آپ دیکھنے"۔ جیمی نے شوخ آنکھوں سے جن میں مایوسی و حسرت کی چمک تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میچ تو ہوگا مگر میں نہیں کھیلوں گا"۔

"دیکھئے آپ ضرور کھیلئے۔ میرے کہنے سے صرف......"

ہیں نہ کھیل سکوں گا بملا" جیمی نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔ بملا کی نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ جیمی کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جو کسی عزیز اور قیمتی شے کے گم ہو جانے کے بعد مایوسی و نا اُمیدی میں پیدا ہو جاتی ہے"۔

"صرف میری خاطر ایک بار" بملا کے منہ سے نکل گیا۔

"اچھا ـــ آپ کی خاطر صرف ایک بار ـــ" جیمی کے منہ سے بھی غیر ارادی طور پہ نکل گیا۔

(۸)

"آج شام کو میچ ہے۔" جیمی نے بملا سے کہا۔

"میں ضرور آؤں گی دیکھنے چاہے کچھ بھی ہو"۔ وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔

"دیکھئے ضرور آئیے گا۔ ورنہ پھر شاید آپ کبھی میرا کھیل نہ دیکھ سکیں گی۔ کیونکہ یہ آخری ہو گا۔"

"ہیں۔ ہیں کیا کہتے ہیں آپ؟" بملا کے منہ سے بیتابانہ نکل گیا۔

"میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا" جیمی نے کہا۔ "اصل میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے منع کر دیا ہے کھیلنے کو۔"

"ڈاکٹر نے ـــ کیوں؟" بملا نے حیرت سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم نے اپنی تندرستی اور طاقت سے زیادہ محنت کی ہے۔ تمہارے بازوؤں کے پٹھوں پہ ان کی برداشت سے زیادہ زور پڑا ہے۔ اس لئے وہ بہت زیادہ سخت ہو گئے ہیں" جیمی نے رُکتے ہوئے کہا۔ بملا حیرت زدہ اس کو تک رہی تھی۔ اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر اب ان پر زور پڑا تو رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس نے تو ایسا کام

بھی کرنے کو منع کر دیا ہے جس سے ہاتھ پر زور پڑے۔ وہ کہتا ہے کہ تم موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑے ہو۔"

"ہیں ــــ!" بملا کے منہ سے بے اختیاری کے طور پر ایک دبی ہوئی چیخ نکل گئی۔ "پھر آپ کیوں کھیل رہے ہیں۔ منع جو......"

"صرف آپ کی خاطر" جیمی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں انتہائی مایوسی اور سوز تھا۔

"نہیں نہیں، آپ نہ کھیلئے"۔ بملا نے بیتابانہ کہا۔ "آپ ہرگز نہ کھیلئے، اور ــــ اور" بات بدلتے ہوئے "میں نے تو آپ کا کھیل دیکھا ہے۔ تین سال ہوئے جب کشمیر کی ٹیم سے میچ جیتا تھا تب میں نے دیکھا تھا۔"

"جی ہاں، ضرور دیکھا ہوگا آپ نے"۔ جیمی کی آواز میں طنز اور مایوسی کا ایک عجیب امتزاج تھا۔

"نہیں، میں سچ کہتی ہوں میں نے دیکھا ہے"۔ بملا اپنے جھوٹ کو چھپاتے ہوئے بولی۔ "دیکھئے آپ نہ کھیلئے۔ صرف میری خاطر نہ کھیلئے۔" بملا نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"بملا اب بہت مشکل ہے۔ میں اب پرنسپل صاحب اور گیم سیکریٹری سے وعدہ کر چکا ہوں میرا نام بھی درج کر لیا گیا۔ وہ تو مایوس ہی ہو گئے تھے۔ مگر میرے کہنے سے وہ اچھل پڑے اور مجھے گلے لگا لیا۔ اب میں انہیں مایوس نہ کرونگا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ بملا اس کا انجام بھی مجھے معلوم ہے مگر میں وعدہ کر چکا ہوں اب وعدہ سے پھرنا ناممکن ہے۔"

"دیکھئے آپ نہ کھیلئے۔ پرنسپل صاحب سے کہدیجئے۔ جب ڈاکٹر صاحب کہدیں گے

تو وہ خود منع کر دیں گے —— مگر آپ نہ کھیلئے" بملا نے کہا۔ اس کی آواز میں اشکوں کا تلاطم تھا۔

"نہیں بملا اب یہ نہیں ہو سکتا۔ میں اپنے الفاظ دے چکا ہوں بس آپ کھیل دیکھنے ضرور ہی آئیے گا۔ یہ میرا آخری کھیل ہوگا" جیمی نے اپنے جذبات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" بملا کے منہ سے ایک دبی ہوئی آواز نکلی۔ اور اس کی آنکھوں میں پگھلے ہوئے تارے جھلملانے لگے۔

(۹)

آج شہر میں عجیب چہل پہل تھی۔ آسٹریلین ٹیم سے کالج کا میچ تھا اور جیمی کھیل رہا تھا۔ لوگ میچ سے کئی کئی گھنٹے پہلے جا کر میدان میں منتخب مقامات پر بیٹھ گئے تھے کیونکہ اُن کا تجربہ تھا کہ پھر جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ لیڈیز کیلئے الگ شامیانہ لگا ہوا تھا۔ سیٹی بجی اور کھلاڑی میدان میں آ گئے۔ جیمی نے دھڑکتے ہوئے دل اور پُر اندیشہ نظروں سے شامیانے کی طرف دیکھا۔ بملا سنہری کنارہ کی آسمانی ساڑھی میں بہشتی حور کی طرح جلوہ گر نظر آئی۔ اب وہ بالکل مطمئن تھا اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ہاکی کو لچکایا۔ سیٹی بجی اور کھیل شروع ہو گیا۔ دوست دشمن سب کی نظریں آج جیمی پر تھیں اُمیدوں کا تنہا مرکز جیمی ہی تھا۔ اسی پر کھیل کا دارومدار تھا۔

آج جیمی کا کھیل پہلے سے کہیں زیادہ دلفریب جاذبِ نظر اور حسین تھا آج اس میں غضب کی پھرتی اور بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ لیکن مخالف ٹیم بھی بہت نشیب و فراز دیکھے ہوئے تھی باوجود جیمی کی انتہائی کوشش کے کوئی گول نہ ہوا۔ ہاں مخالف

کھلاڑیوں کو پسینے چھوٹنے لگے۔ سب اس دُبلے پتلے لڑکے کے معراج کمال پر پہنچے ہوئے کھیل کو دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ اور انہیں اپنی عزت و آبرو بچانی مشکل نظر آ رہی تھی تھوڑی دیر کے بعد وقفہ کی سیٹی بجی۔ کھلاڑی منتشر ہو گئے۔ جیمی نے پھر شامیانہ کی طرف دیکھا۔ ملاؔ کی نازک عینک کی سُنہری کمانیاں دور سے چمکیں۔ اس کا رومال ہوا میں ہلتا ہؤا نظر آیا جیسے وہ گرمی کے بہانہ ہلا رہی تھی۔ اب جیمی مطمئن تھا۔ اور ہر بات کے لئے بالکل تیار۔۔۔ سیٹی بجی اور کھیل پھر شروع ہو گیا۔ اب جیمی نے پہلے سے زیادہ پھرتی سے کھیل شروع کیا۔ مخالفوں کی ٹانگوں سے نکالتا ہؤا اور اُچھالتا ہؤا آگے بڑھا۔ ایک کھلاڑی کو چرکا دیکر گیند آگے پھینکی اور بڑھ کر جلدی سے ہٹ لگایا۔ گیند سنسناتی ہوئی گول میں گھُس گئی۔ میدان تالیوں سے کئی منٹ تک گونجتا رہا۔ مخالفوں کی رنگت اُڑ گئی۔

آج جیمی بہت لاجواب کھیل رہا تھا۔ یہاں تک کہ خود اسے بھی اپنے کمال کا احساس تھا۔ گیند کے پیچھے میدان میں بیتابانہ موج کی طرح بھاگتا پھرتا تھا۔ میدان "ہپ ہپ جیمی" "ہپ ہپ جیمی" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ فضا میں تالیوں سے شور مچ رہا تھا۔ ریشمی رومال ہل ہل کر جیمی کے اندر برقی طاقت کا اضافہ کر رہا تھا۔ جیمی نے یکے بعد دیگرے دو گول کئے آسٹریلین ٹیم کی ہمتیں چھوٹ گئیں لوگ حیرت سے جیمی کو دیکھ رہے تھے ان کا خیال تھا کہ آج جیمی کھیل نہیں رہا بلکہ کمال دکھا رہا ہے۔ گیند پر نظر نہ ٹھہرتی۔ یا تو گول میں نظر آتی یا جیمی کی اسٹک پر۔ وقت ختم کے قریب تھا۔ جیمی کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ شوخ بال بار بار اس کے چہرہ پر بکھر جاتے۔ سینہ کا تموج موجوں کے بیتابانہ تلاطم سے

مشابہ تھا۔ مگر جیمی آج بہت مطمئن تھا۔ یکایک اسے بازوؤں میں عجیب کیفیت محسوس ہوئی۔ سختی بڑھنے لگی جیسے وہ جم رہے ہیں اور پھر ایسا معلوم ہوا جیسے اُبھر رہے ہیں۔ مگر سوچنے کا موقع نہ تھا۔ گیند لیکر وہ گول تک پہنچ چکا تھا۔ مگر کیا ہٹ بھی اسی طاقت سے لگ سکے گا؟ اپنے بازوؤں کی بڑھتی ہوئی تکلیف سے اسے اندیشہ تھا۔ "کہیں رگیں نہ پھٹ جائیں"۔ مگر آج وہ ہر چیز کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ اس نے آہستہ سے گیند اُچھالی اور پوری طاقت سے ہٹ لگایا —— گیند گول کیپر کی ہاکی سے لگتی ہوئی گول میں گھس گئی۔ میدان تالیوں اور نعروں سے گونج اُٹھا —— گول کیپر کا ہاتھ جیسے اُکھڑ گیا ہو —— ہاکی ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔

اور جیمی —— اس کے بازوؤں میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ بازوؤں میں ہزاروں چیونٹیوں نے یکلخت کاٹ لیا۔ انگلیاں خود بخود کھل گئیں —— ہاکی چھوٹ پڑی۔ اور وہ —— گر پڑا —— !

کھیل ختم ہونے کی سیٹی بج چکی تھی ——

ٹوپیاں اُچھل رہی تھیں —— نعرے لگ رہے تھے —— اور ریشمی رومال ہلکی ہلکی لرزشیں لے رہا تھا —— !!

شادی کا تحفہ

شام کا وقت تھا ظہیر ابھی کالج سے لوٹا تھا۔ ناشتہ کر کے اپنے کمرہ میں اوپر چلا گیا اور ایک رسالہ اُٹھا کر مسہری پر لیٹ گیا سامنے دریچہ کا ریشمی پردہ ہوا سے ہلکی ہلکی جنبشیں لے رہا تھا۔ ایک مرتبہ ہوا کے ایک شوخ جھونکے سے پردہ ایک طرف سرک گیا۔ پڑوس کے مکان کے بالائی کمرہ کا دریچہ نیم وا تھا۔ سامنے کوئی لیٹا ہوا تھا۔

شاید کوئی دوشیزہ دریچہ کے رُخ مسہری پر لیٹی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھی۔ سامنے کھلے ہوئے اخبار سے اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ ظہیر ایک لمحہ تک دیکھتا رہا اور پھر اس کی نظریں اپنے رسالہ پر جم گئیں۔ اب اس سے کچھ نہ پڑھا گیا۔ حرف ناچتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اس نے پھر دیکھا اب رسالہ ہٹا ہوا تھا اور ظہیر کو دو چمکتی ہوئی شریر آنکھیں اپنے اوپر جمی ہوئی نظر آئیں۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ وہ اس غیر متوقع حرکت پر جھینپ سی گئی اور اس انداز سے اخبار سامنے کر لیا گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ظہیر بھی رسالہ پڑھنے لگا۔ لیکن اس کی نظریں بار بار اسی دریچہ ہی کی طرف جاتیں اور ناکام لوٹ آتیں۔ اخبار بدستور پڑھا جا رہا تھا ظہیر نے بھی افسانہ پڑھنے کی نیت سے صفحہ اُلٹا۔ مگر ایک افسانۂ مجسم کے سامنے ان خالی و بے معنی حروف میں کیا جی لگتا۔ اس نے پھر کنکھیوں سے ادھر دیکھا۔

نہ معلوم کونسا اخبار تھا جو اس قدر مرکزِ توجہ بنا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اخبار کے ایڈیٹر اور مضمون نگاروں کو کوسنے لگا۔ آخر تھک کر اس نے اپنا رسالہ پڑھنا شروع کیا۔ مگر نہ معلوم اس کے مضمون نگار کیسے تھے جو ایک منٹ کے لئے بھی اس کی توجہ کو مبذول نہ کر سکے — مگر ابھی چند منٹ پہلے تو یہ رسالہ اس قدر خشک اور غیر دلچسپ نہ تھا! اس نے دریچہ کیطرف دیکھا اور پھر اپنا رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور برابر پڑھتا ہی رہا جب کچھ دیر ہو گئی تو اس نے آہستہ سے رسالہ رکھ کر دیکھا۔ اخبار ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ نشست بدلی ہوئی تھی۔ وہ دریچہ کے قریب لیٹی ہوئی تھی، کہنیاں تکیہ پر تھیں اور ہاتھوں پر چہرہ رکھے ہوئے بڑی توجہ سے ظہیر کو دیکھ رہی تھی۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی نارنجی کرنیں اس کے حسین چہرہ پر ناچ رہی تھیں۔ بڑی بڑی چمکدار آنکھیں کھلے ہوئے کنول کی طرح دمک رہی تھیں۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ملتے ہی جیسے بجلی کوند جائے دونوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوئی۔ ظہیر سکتہ کے عالم میں رہ گیا اور ادھر — ادھر جیسے ایک چور عین موقعۂ واردات پر پکڑا جائے۔ وہ ایسی مبہوت ہوئی کہ اس چوری کی شرمندگی اور موقعۂ واردات پر پکڑے جانے کی ندامت میں مدافعتی کارروائی کا بھی خیال نہ رہا۔ چند لمحے دونوں اسی طرح دیکھتے رہے۔ اور درمیان میں حدِ فاصل ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو بالکل قریب محسوس کرنے لگے۔ اتنے میں نیچے سے کسی نے ظہیر کو پکارا اور یہ حسین طلسم ایک غیر محسوس جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ ابھی آفتاب نہ طلوع ہوا تھا۔ ظہیر دریچہ کے سامنے والی میز

کے پاس بیٹھا ہوا کالج کا کام کر رہا تھا۔ گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ اسے پڑھتے ہوئے ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک کنکری اس کی کتاب پر آ کر لگی اس نے چونک کر دیکھا مگر دوسرے مکان کا دریچہ بند تھا۔ اس نے کچھ زیادہ توجہ نہ کی اور پھر پڑھنے لگا۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ تین چار کنکریاں اس کے دریچہ کی جالیوں سے ٹکرا کر اندر آئیں اور کتاب پر بکھر گئیں۔ مگر اب کے اسے ایک شرارت سوجھی۔ نہ اس نے کتاب پر سے نظر اُٹھائی اور نہ کنکریوں کو ہٹایا بلکہ اسی طرح بیٹھا رہا جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نظر اُٹھائی سامنے کا دریچہ نیم وا تھا اور وہی دو شریر آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے کتاب پر سے ایک کنکری اُٹھا کر ماری۔ دریچہ یکلخت بند ہو گیا۔ کنکری کھٹ سے شیشہ پر لگی اور باہر گر گئی۔ ساتھ ہی اندر ایک نازک نقرئی قہقہہ کی دلکش آواز گونجی۔ ظہیر نے پھر قصداً کتاب پر نظر جمالی۔ اتنے میں اُدھر کسی نے اسے نجمہ کہکر پکارا اور وہ نیچے چلی گئی۔

اس بات کو دو دن گزر گئے تھے۔ ظہیر کی خالہ زاد بہن نگہت آئی تھی۔ دونوں تقریباً ہم عمر ہی تھے۔ نگہت اور نجمہ ساتھ اسکول میں پڑھ چکی تھیں۔ دونوں ایک دُوسرے کی بہت راز دار اور گہری دوست تھیں۔ اب مُدت کے بعد ملنا ہُوا تھا اس لئے نجمہ نگہت سے ملنے آئی تھی۔ ظہیر کالج گیا تھا۔ وہ کالج سے آ کر سیدھے اسی کمرہ میں چلا گیا۔ نگہت شاید کسی دُوسرے کام سے چلی گئی تھی۔ نجمہ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ کواڑ بند تھے۔ ظہیر کو معلوم نہ تھا وہ اندر چلا گیا۔ ابھی اس نے ایک قدم ہی رکھا تھا

کہ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ دونوں ٹھٹھر سے ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر ظہیر نے شرارتاً کہا۔ "کیوں صاحب آپ ہی مجھے پڑھتے میں ستاتی ہیں!"

"مَیں ستاتی ہوں یا آپ کنکریاں مارتے ہیں"۔ نجمہ نے غیر متوقع طور پر فوراً جواب دیا۔

"بالکل جھوٹ" ظہیر تیزی سے بولا "پہلے آپ نے ماری تھیں کنکریاں۔"

"جی۔ اور آپ نے نہیں ماری تھیں میرے" وہ شرارت سے مُسکرائی۔" اور جو لگ جاتی میری آنکھ میں۔"

"غلط...." ظہیر ابھی کچھ کہنے ہی نہ پایا تھا کہ نگہت دُوسرے دروازے سے چائے کی کشتی لئے ہوئے داخل ہوئی پہلے تو دونوں کو یوں دیکھ کر معنی خیز انداز میں مُسکرائی اور ظہیر سے بولی۔ "دیکھتے نہیں ہو ظہیر پردہ ہے۔ بغیر آواز دیئے گھسے آتے ہو۔"

"تو ہمیں بتایا تھا کسی نے کہ پردہ ہے؟ کنکریاں مارنے کیلئے پردہ نہیں ہے۔" ظہیر نے دروازے ہی سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا پہلے چائے تو پلوائیے۔"

"بڑے بدتمیز ہو جبھی تم"۔ نگہت نے قصداً جلانے کو کہا۔ "کالج میں پہنچ گئے مگر رہے ویسے کے ویسے ہی۔ پہلے مہمان کو لے لینے دو۔"

"جی ہاں بڑی مہمان آئی ہیں"۔ ظہیر نے اکھڑپن سے کہا۔ "ہم مہمان وہمان کچھ نہیں جانتے پہلے چائے دو۔ نہیں تو آتا ہوں مَیں خود لینے"۔ یہ کہکر اس نے ایک قدم اندر رکھا۔

"ہیں ہیں" نگہت چیخی "کیا کرتے ہو وہیں رہو مَیں لاتی ہُوں چائے۔"

ظہیر رُک گیا۔ نگہت ایک پیالی میں چائے لیکر آئی۔ ظہیر صرف پیالی دیکھ کر بولا۔
"لے جائیے بس آپ اپنی چائے۔ لے آئیں ایک پیالی میں اور سینی میں جو الا بلا رکھی تھی وہ کہاں گئی۔ یہ بھی اپنے مہمان کو پلا دیجئے مجھے نہیں چاہیئے۔"
"ہاں ـــــ بس ـــــ شکریہ" نگہت نے چڑانے کو کہا۔ "اب آپ تشریف لے جائیے۔ باہر جا کر زہر مار کیجئے الا بلا"۔ ظہیر جلکر چلا گیا اور نجمہ کے متعلق سوچنے لگا۔ کیسی بیباک ہے۔ حُسن اور بیباکی! کہیں وہ نگہت سے نہ کہدے۔ ہاں اگر کہدے تو اور اچھا ہے اس کے بہانے سے ملاقات ہی ہو جایا کریگی۔
جب ظہیر چلا گیا تو نگہت نجمہ سے بولی۔ "تو کیا ظہیر یہاں آ گئے تھے"۔
"نہیں یہاں تو نہیں آئے مگر ہاں دروازے میں کھڑے تھے"۔ نجمہ نے کہا۔
"سامنا تو نہیں ہؤا تمہارا۔"
"سامنا!" نجمہ کو شرارت سُوجھی۔ "مَیں چھُپتی تھوڑی ہوں اُن سے۔"
"اچھا"۔ نگہت بولی "مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ بیچارے کو ہیں بُلا لیتی اب باہر بیٹھا تاپتا ہوگا۔
نجمہ نے نگہت کو کنکریوں والی بات بتائی تو نگہت نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تو یوں کہو کہ پھانس لیا تم نے بیچارے کو"
"جی ہاں بڑے بیچارے ہیں جو پھنس جائیں گے"۔ نجمہ نے نگہت کے گدگدی کرتے ہُوئے کہا۔ "وہ تو اُسدن پھوڑ دی ہوتی میری آنکھ"۔
"ارے ارے ـــــ ارے" نگہت نے گدگدیوں سے بیتاب ہو کر کہا۔
"چھوڑو کیا کرتی ہو ـــــ بُلائے دیتی ہوں ابھی اسے وہ تو خود انتظار میں ہوگا"۔

"ایک تو بھگا دیا" نجمہ نے نگہت کے زبردستی گدگدی کرتے ہوئے کہا۔ "بات بھی نہیں کرنے دی اور اب چلی ہیں بُلانے" نگہت گدگدیوں سے بیتاب ہو رہی تھی بولی۔ "اوئے بھئی چھوڑ تو۔ کیوں مارے ڈالتی ہو گدگدا کے مجھے معلوم ہوتا تو چائے ہیں اور دیر لگا دیتی یا پھر چائے پر اُسے بھی بُلا لیتی۔ اچھا سنو۔ اس نے گدگدی سے بچنے کے لئے نجمہ کے باہیں ڈالتے ہوئے کہا "اب کے تم آؤ گی تو میں کہیں بہانہ چلی جاؤں گی اور تم باتیں کر لینا"

(۳)

نگہت نے نجمہ کو چائے پر بُلایا تھا۔ گھر کے دُوسری طرف باغ میں دونوں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ظہیر ابھی کھیل سے واپس نہیں آیا تھا۔ اس کا انتظار ہو رہا تھا۔

نجمہ:۔ بڑی دیر لگا دی۔ ٹینس تو ختم ہو گیا ہو گا۔

نگہت:۔ تو ایسی بے صبری کیا ہے۔ اتنی بیتاب کیوں ہوتی ہو آتا ہی ہو گا۔

نجمہ:۔ (ذرا تنک کر) بیتاب کون ہو رہا ہے۔ تم اپنی کہو آج تمہارا رنگ بدلا ہے۔

نگہت:۔ کیوں میرا رنگ کیا دیدنی ہے۔ میں تو ہر وقت ہی یہاں رہتی ہوں۔ مگر مجھے اپنے ہی غم سے فرصت نہیں——"

نجمہ:۔ اوہو تمہارا کیا غم ہے۔ ذرا میں بھی سُنوں۔

نگہت:۔ ہے ایک غم نہیں کیا۔۔۔۔۔۔

نجمہ:۔ اچھا اب میں سمجھی (ہنستے ہوئے) اختر کا غم ہو گا۔ اگر ایسا غم تھا تو پھر بیچارے کو چھوڑ یہاں کیوں چلی آئیں۔ وہ وہاں بیچارا۔۔۔۔۔"

نگہت:۔ بس بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ وہ تشریف ہی لاتے ہونگے تمہارے۔۔۔

نگہت نے اپنی بات پوری نہ کی تھی کہ ظہیر ریکٹ ہلاتا ہوُا باغ کے دُوسرے دروازے سے داخل ہوُا۔ نگہت بولی۔

"آؤ بھی انتظار ہی ہو رہا تھا تمہارا۔ آج بڑی دیر لگا دی۔"

ظہیر:۔ معاف کیجئے گا بڑا انتظار کرنا پڑا۔

نگہت:۔ جی —— مجھے تو انتظار کی ضرورت پڑی نہیں تھی ہاں.....

نجمہ نے تیز نظروں سے نگہت کو دیکھا اور نگہت مسکرا کر چُپ ہو گئی۔

ظہیر:۔ ہاں —— ہاں کیا؟

نگہت:۔ ہاں یہ کہ اب چائے زہر مار کیجئے۔

ظہیر:۔ تو آپ لوگ کتنی دیر سے یہاں منتظر ہیں۔

نگہت:۔ آپ لوگ کیوں یہ کہو کہ (نجمہ کی طرف اشارا کر کے) یہ کتنی دیر سے منتظر تھیں۔

نجمہ نے پھر تیزی سے نگہت کو دیکھا مگر نگہت چائے دانی اُٹھا کر بولی "ذرا مَیں چائے لے آؤں۔"

جب نگہت چلی گئی تو ظہیر نجمہ سے مخاطب ہوُا۔

"آپ کو بڑا انتظار کرنا پڑا معاف کیجئے گا!"

"نجمہ:۔ جی ہاں آپنے تو کہدیا کہ معاف کیجئے اور یہاں دو گھنٹہ سے بیٹھے ہیں،

"ظہیر:۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔ ٹینس کھیل کر ذرا اسٹال چلا گیا وہاں دیر ہو گئی۔

نجمہ:۔ اور مَیں نے آپ کو صبح ہی دریچہ میں سے بتا دیا تھا کہ آج نگہت

نے بلایا ہے مگر پھر بھی خیال نہ رہا۔

ظہیر:۔ بالکل یاد ہی نہیں رہا۔ ورنہ ایسا ممکن تھا کہ میں آپ کو منتظر رکھتا؟

نجمہ:۔ خیر اب یہ بتائیے کہ......

نجمہ ابھی پوری بات بھی نہ کہنے پائی تھی کہ نگہت چائے لیکر آگئی۔ اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ تینوں چائے پیتے رہے۔ درمیان میں نگہت کبھی کسی اور بہانہ سے اُٹھ کر چلی جاتی اور دونوں آپس میں گفتگو کر لیتے۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا۔ چاند اپنی مدھم مدھم کرنیں پھینکنے لگا۔ چائے پی کر نجمہ بولی "اچھا اب چلتی ہوں ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

نگہت:۔ ایسا کونسا دور جانا ہے۔ بیٹھو بھی۔

نجمہ:۔ نہیں پھر آؤں گی اب تو دیر ہو گئی ہے۔

ظہیر:۔ اس تکلیف کا شکریہ۔

نگہت:۔ ایسے شکریہ ادا کر رہے ہیں جیسے انہی نے بلایا تھا۔

ظہیر:۔ نہیں تو جیسے تم نے بلایا تھا؟

نگہت:۔ جی نہیں بھلا میرے بلانے پہ کیسے آتیں وہ تو تم نے ہی بلایا ہوگا۔

ظہیر:۔ اچھا جانے دو۔ پوچھ لو ان سے کس نے بلایا تھا۔

نجمہ:۔ ارے تو آپ دونوں لڑتے کیوں ہیں۔ کسی نے بھی نہیں بلایا تھا میں تو خود آئی تھی۔

ظہیر: (ہنستے ہوئے) بس چلو اب تو قصہ ختم ہوا۔ تم تو خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتی ہو (نجمہ سے) اب تو آپ خود تشریف لائی تھیں۔ اب کے میں بلاؤنگا تو تشریف

لا ہیے گا؟

نجمہ:۔ بہتر ہے۔

نجمہ چلی گئی تو نگہت بولی "کہو کیا کیا باتیں ہوئیں"

ظہیر:۔ (شرارت سے مسکرا کر) باتیں کیا ہوئیں وہ اختر کو پوچھ رہی تھی....

نگہت:۔ بس بہکنے لگے۔ سیدھی طرح باتیں بتاؤ زیادہ بدتمیزی مت کرو۔

ظہیر:۔ تو اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے۔

نگہت:۔ جی نہیں بڑی تمیز کی بات ہے۔

ظہیر:۔ اچھا تو ناراض کیوں ہوتی ہو تم نے اچھی طرح تو باتیں کرنے ہی نہیں دیں۔ ہر دفعہ ادھوری رہ جاتی تھیں۔ مگر پھر بھی ہو گئیں باتیں۔

نگہت:۔ تو آخر کیا باتیں ہوئیں۔

ظہیر:۔ تو اب کیا ہر بات بتا دوں۔ کچھ پرائیویٹ باتیں تھیں۔

نگہت:۔ اوفو پرائیویٹ باتیں بھی ہو گئیں۔ بھئی بڑے چلتے ہوئے ہو تم تو کیا پیام دیدیا تم نے........

ظہیر:۔ بس اب بہکنے لگیں تم بھی۔ اور نہیں جو اختر نے انگوٹھی دی تھی اس کا کیا کیا۔ کیا واپس کر دی بے چارے کو........

نگہت:۔ آہا ذرا سی شبہ پا کر کیا اُچھلتے ہیں۔ انگوٹھی سے آپ کو کیا مطلب۔

ظہیر:۔ بس ناراض ہو گئیں تو پھر ہم سے مذاق کیوں کرتی ہو۔

(۴)

شام کا وقت تھا۔ ظہیر، نجمہ، نگہت تینوں تاش کھیل رہے تھے۔ نجمہ جیت رہی

تھی۔ ظہیر کے بنے ہوئے پتے سب سے کم تھے۔ پھول کا بادشاہ پڑا ہوا تھا نجمہ اور نگہت اپنے اپنے پتے ڈالنے کے لئے سوچ رہے تھے۔ ظہیر نے چپکے سے نجمہ کے بنے ہوئے پتوں میں سے ایک "ہاتھ" اُٹھا کر اپنے پتوں میں ملا لیا۔

"پھول کا دہلا" نگہت نے پتہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ادھر لاؤ سب" نجمہ نے اِکّا ڈالتے ہوئے کہا اور سب پتے اُٹھا کر اپنے بنے ہوئے ہاتھوں میں شامل کر لئے۔

"ارے —" نجمہ نے اپنے بنے ہوئے "ہاتھ" گنتے ہوئے کہا۔ "ایک دو تین چار — میرے پانچ بنے تھے۔ ایک کہاں گیا"

"نگہت نے چرایا ہوگا" ظہیر نے بے پروائی سے کہا۔

"جی ہاں چور تو خود ہو" نگہت چمک کر بولی "اور الزام دوسروں کو دیتے ہو"

"دکھائیے اپنے بنے ہوئے ہاتھ" نجمہ بولی۔

"ہم نہیں دکھاتے" ظہیر نے پتوں کو اپنے قبضہ میں کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے"

"اور دوسروں کے پتے چرانے کا قاعدہ ہے" نجمہ مسکراتے ہوئے بولی "پتے دکھائیے ورنہ ہم نہیں کھیلتے بے ایمانی سے —"

"اچھا لو دیکھو" ظہیر نے گنتے ہوئے کہا۔ "میرے چار ہاتھ بنے تھے۔ ایک دو تین اور یہ چار"

"چار بہت بنے" نجمہ نے پتوں پر جھپٹا مار کر ایک ہاتھ اُٹھا لیا "تین تھے آپ کے"

"اچھا لو۔ تو رو ٹے کیوں دیتی ہو۔"

پھر تینوں کھیلنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ظہیر نے اپنے بنے ہوئے پتوں میں سے حکم کا بادشاہ اُٹھا کر اپنے پتوں میں سے معمولی سا پتہ ملا دیا۔ نگہت نے حکم کی بیگم چلی۔ اور اس کو یقین تھا کہ اب یہ ہاتھ اسی کا بنے گا۔ نجمہ نے حکم کا دہلا پھینکا۔

"کہاں چلیں بیگم صاحب" ظہیر نے بادشاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ جو تشریف رکھتے ہیں ابھی۔"

"کیا — کیا۔" نگہت نے بادشاہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کہاں سے آگیا۔ ابھی تو بن چکا ہے۔"

"جی۔ آپ کے ہاں تو ہر چیز بن چکی ہے۔" ظہیر نے پتے جلدی سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ادھر لاؤ۔" نگہت نے پتے جھپٹے "دکھاؤ اپنے بنے ہوئے ہاتھ۔" ابھی تو یہ حکم کا بادشاہ بن چکا ہے۔"

"لو دیکھو" ظہیر نے بنے ہوئے پتے پھینکے۔ نگہت نے سب کا مقابلہ کیا "یہ دیکھو بے ایمان زمانہ بھر کے۔ دو پتے حکم کے اور یہ اس میں اینٹ کی دوکی کہاں سے آگئی ہے"

"ہاں ہاں واپس لیجئے۔" نجمہ نے جلدی سے کہا "کھیل کھیل میں بے ایمانی کرتے ہیں۔"

"کوئی بے ایمانی نہیں ہے" ظہیر نے پتے اپنے قبضہ میں کئے۔ "ہمیں نہیں معلوم کس نے یہ دوکی ڈالدی۔ نجمہ کی حرکت ہوگی۔"

"بے ایمانی اور پھر جھوٹ۔" نجمہ بولی۔

"ہم نہیں دینگے جی پتے" ظہیر نے کہا "نہیں تو اب تک ہمارے ہاتھ بنے ہیں اِس پہ بھی چین نہیں آتا"۔

"کھیل میں روتے ہو تو پھر کھیلتے کیوں ہو" نگہت نے کہا۔

"ہم نہیں کھیلتے ایسی بے ایمانی میں" نجمہ نے اپنے تاش پھینک دیئے۔ "کبھی اس کے ہاتھ" چرا لیئے کبھی اس کے پتے غائب کردیئے"۔

"یہ تو ہاتھ کی صفائی ہے" ظہیر نے ہنستے ہوئے کہا "بے ایمانی تھوڑی ہے آپ اتنی بے خبر کیوں ہو جاتی ہیں"۔

"ہوں! ہاتھ کی صفائی ہے" نگہت نے چڑھتے ہوئے کہا "ہم بھی نہیں کھیلتے" اور پتے پھینک دیئے۔

"بس رو دیں سب" ظہیر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور پتے سمیٹنے لگا "وہ تو عورتوں کی عادت ہی ہے"۔ ظہیر نے ایک اور فقرہ چست کیا۔

"وہ تو عورتوں کی عادت ہی ہے" نجمہ نے چڑھتے ہوئے فقرہ دوہرایا۔ "اور بے ایمانی مردوں کی"۔

"اچھا جانے اب کون تمہیں رلائے" ظہیر نے تاش ڈبہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "نگہت سینما چلتی ہو"؟

"ہاں۔ ہاں"۔ نگہت اور نجمہ دونوں ساتھ بولیں۔

"اب کیسی جلدی ہاں ہاں کی"۔ ظہیر نے فقرہ کسا۔

"کونسے کھیل ہیں" نجمہ بولی۔

"فیشن میں چلو" نگہت نے رائے دی۔

"جی نہیں۔ میں ہندوستانی کھیل نہیں دیکھتا ہوں"۔ ظہیر نے قصداً چڑاتے ہوئے کہا۔ "میں تو ٹرنر میں جاؤنگا۔ انگریزی کھیل ہیں"۔

"بڑے انگریز آئے کہیں کے"۔ نگہت بولی۔ "چاہے چار جملے صحیح نہ بول سکتے ہوں مگر کھیل دیکھیں گے انگریزی"۔

"بس ایک تمہیں تو جانتی ہو انگریزی اور کوئی تھوڑی ہی جانتا ہے"۔ ظہیر نے اس فقرہ پر تلملاتے ہوئے کہا۔

"میں کب انگریزی دانی کا دعویٰ کر رہی ہوں۔ نگہت نے کہا۔ "تم کہو اپنی بڑے صاحب بہادر بنتے ہیں مگر چار جملے صحیح نہیں بول سکتے چار جملے"۔ نگہت نے چار پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ظہیر اس پر چڑ گیا۔ "انگریزی تو بس ایک تمہارے اختر صاحب ہی جانتے ہیں اور کوئی تھوڑی بول سکتا ہے"۔ ظہیر نے نگہت کی دکھتی ہوئی رگ پکڑی "بس وہی ہیں شکسپیر اور ملٹن کے والد صاحب قبلہ۔

"بس بس سیدھی طرح بات کرو"۔ نگہت بھی چڑھ گئی۔

"ہاں ہاں یہ تو چار کیا تین جملے بھی مسلسل انگریزی کے نہیں بول سکتے"۔ نجمہ نے نگہت کو شہ دی۔

ارے تم تو تین کو کہہ رہے ہو میں کہتی ہوں کہ جملہ بھی نہیں بول سکتے صحیح ایک بھی"۔ نگہت نے فقرہ چست کیا۔ "ورنہ ابھی بول کر دکھاویں ہمارے سامنے"۔ یہ وار نگہت کا سخت پڑا۔

"اچھا نہیں بول سکتے پھر آپ کو مطلب"۔ ظہیر نے بھنا کر کہا "یہاں کوئی

تم سے شادی ....

"دوں گی تھپڑ کھینچ کے اگر بدتمیزی کی ہو گی تو" نگہت ایکدم تیز ہو گئی۔ نجمہ سے کہا کرو ایسی باتیں ——"

"بس —— بس چڑ گئیں" ظہیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور عورتوں کو آتا ہی کیا ہے سوائے رونے اور چڑھنے کے"

نگہت اور نجمہ دونوں ہنستا کر وہاں سے چلی گئیں۔

(۵)

ظہیر اور نجمہ کی ملاقاتیں اسی طرح نگہت کے ذریعہ ہوتی رہیں! اور محبت کا جذبہ جو بے تکلفی اور شرارت کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ غیر شعوری طور پر جڑ پکڑتا گیا۔ نجمہ اکثر نگہت سے ملنے آتی۔ پھر وہ تینوں کبھی تاش کھیلتے اور کبھی نگہت اِدھر اُدھر چلی جاتی اور وہ دونوں یکدم کھیلتے رہتے۔ اسی طرح یہ خوشگوار لمحات گذرتے رہے۔ ظہیر کے سالانہ امتحان بھی قریب آگئے اور اِدھر نگہت کے والد بھی اُسے بلا رہے تھے۔ نگہت تو بہت پہلے سے جانیکو تیار تھی لیکن اِدھر ظہیر اور اُدھر نجمہ نے روک رکھا تھا۔ ظہیر کی والدہ نے بھی کہا کہ روز روز کون آتا ہے چلی جانا۔ غرض اس کو دو مہینہ سے زیادہ گزر گئے۔ وہ جانے کی تیاری میں مصروف تھی اور ظہیر امتحان کی تیاری میں۔

نگہت اس کے کمرے میں آئی اور بولی۔

"ظہیر میں کل جا رہی ہوں"

"کل؟" ظہیر نے چونک کر کتاب پر سے نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں"!

"لیکن نگہت یہ تو بہت ویسی بات ہوئی" ظہیر افسردہ لہجے میں بولا "اب کیا ہوگا"۔

نگہت:۔ ہونا کیا ہے (دریچہ کی طرف اشارہ کر کے) نجمہ وہاں کھڑی ہو جائے گی تم یہاں سے باتیں کر لینا۔

ظہیر:۔ تمہیں تو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔

نگہت:۔ تو پھر میں کیا کروں۔ شام کو نجمہ آئے گی مجھ سے ملنے تم دونوں مل کر طے کر لینا۔

ظہیر:۔ ہاں تمہیں اب کہاں سوچنے کی فرصت ہے جا رہی ہو نا اختر کے پاس.......

نگہت بغیر جواب دیئے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ شام کو باغ میں ظہیر نجمہ سے ملا۔ دونوں کچھ افسردہ سے تھے۔

ظہیر کہنے لگا "نجمی اب کیا صورت ہوگی۔ یہ غالباً آخری ملاقات ہے"۔

نجمہ:۔ (مدھم آواز میں) اب آنا تو مشکل ہے ہاں دیکھئے میں اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ آپ کو خط بھجوا دونگی اس کے ہاتھ آپ جواب دیجئے گا۔

ظہیر:۔ اور جو اس نے کہیں پھینک دیا یا کسی اور کو دیدیا۔

نجمہ:۔ نہیں آپ اس کی فکر نہ کریں وہ سمجھدار ہے۔

اتنے میں نگہت آگئی اور نجمہ سے بولی —— چلو تمہارے گھر سے نوکر بلانے آیا ہے۔ میں برابر والے کمرے میں ہوں تم وہیں آجانا"۔

نجمہ:۔ ٹھہرو میں بھی آتی ہوں (ظہیر سے) اچھا اجازت اور ہاتھ ملانے کیلئے

بڑھا دیا۔ ظہیر نے مصافحہ کیا اور ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا۔

(۶)

امتحان ختم ہو گئے۔ نجمہ اور ظہیر کی خط وکتابت اسی طرح ہوتی امتحان کے بعد اس کے والد نے کہا کہ چھٹیوں میں نگہت کے ہاں ہو آؤ۔ وہ اگرچہ جانا نہ چاہتا تھا مگر منع بھی نہ کر سکا۔ پھر اس نے سوچا کہ نگہت کے ذریعہ خط وکتابت میں آسانی رہے گی چنانچہ وہ چلا گیا۔ برابر دونوں میں خط وکتابت ہوتی رہی۔ نجمہ محبت سے بھرے ہوئے ایسے پُرکیف خط لکھتی کہ وہ ایک ایک خط کو کئی کئی بار پڑھتا اور مزے لیتا۔ تمام چھٹیاں اسی طرح گزر گئیں۔ ظہیر کا نتیجہ بھی آ گیا۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہؤا تھا۔ ساتھ ہی اس کے والد کا خط بھی آیا جس میں انہوں نے اسے علی گڈھ پہنچنے کے لئے لکھا تھا۔ اب ظہیر کے لئے عجیب مشکل کا سامنا تھا۔ نہ تو وہ والد کو علی گڈھ نہ جانے کی کوئی معقول وجہ بتا سکتا تھا اور پھر اس کی معقول وجہ کو بھی کون مانتا اور نہ وہاں جانے پر تیار تھا۔ لیکن طوعاً کرہاً اس کو جانا ہی پڑا۔ اس عرصہ میں کئی مرتبہ نجمہ سے دُور کی ملاقاتیں ہوئیں اور خط وکتابت بھی۔ جس دن وہ علیگڈھ جا رہا تھا۔ اس دن نجمہ دریچہ میں آئی ورنہ اب وہ بہت کم دریچہ پر آتی کیونکہ ممکن تھا کہ کوئی دیکھ لیتا اور اتنا سہارا بھی ہاتھ سے جاتا۔

ظہیر:۔ نجمی میں صبح جا رہا ہوں علی گڈھ۔

نجمہ:۔ تو آخر آپ چل ہی دیئے۔

ظہیر:۔ تم سمجھتی ہو کہ میں خود تو جا نہیں رہا ہوں بھیجا جا رہا ہوں۔

نجمہ:۔ لیکن وہاں جا کر مجھے تو نہیں بھول جائیے گا۔

ظہیر:۔ ارے کیسی باتیں کرتی ہو نجمی —— تمہیں بھولنا کیسے ممکن ہے۔ دیکھو میرے خطوں کا جواب دینا۔

نجمہ:۔ میں تو فوراً جواب دیتی ہوں........

ظہیر:۔ اور دیکھو تم میرے خط پھاڑ دیتی ہونا!

نجمہ:۔ واہ پھاڑے بہت۔ وہ تو تمام میرے پاس بڑی احتیاط سے رکھے ہیں —— اور میرے خط —— ؟

ظہیر:۔ تمہارے خط تو تمام سُرخ ربن سے بندھے ہوئے میرے پاس بڑی احتیاط سے رکھے ہیں۔ لیکن کوئی تمہارے پاس دیکھ نہ لے۔

نجمہ:۔ نہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

نیچے سے کسی نے آواز دی اور نجمہ "خدا حافظ" کہکر نیچے چلی گئی۔

ظہیر علی گڑھ چلا گیا۔ پہلے تو بہت پریشان رہا لیکن رفتہ رفتہ حالات نے عادی بنا دیا۔ نجمہ سے خط وکتابت جاری تھی۔ یہی نصف ملاقات کا ایک ذریعہ تھا جس سے دل بستگی رہتی۔ فرصت میں گھنٹوں نجمہ کے تمام خط نکال کر پڑھتا۔ ہر خط اس کو کسی حسین افسانے کا ایک دلچسپ باب معلوم ہوتا۔ نجمہ کے خطوں میں ایک عجیب کیف آور اور سرور انگیز نشہ اسے معلوم ہوتا۔ جس میں وہ دیر تک مدہوش رہتا۔

ایک مرتبہ خلافِ معمول نجمہ کے جواب میں دیر ہوئی۔ ظہیر بہت پریشان ہوا مگر کوئی اور ذریعہ معلوم کرنے کا نہ تھا۔ آخر کئی دن کے بعد اس کا خط آیا۔ لیکن بہت مختصر اور تشنہ —— ظہیر نے فوراً جواب دیا۔ لیکن پھر کئی ہفتہ تک جواب نہ آیا۔ اسی طرح

نجمہ کا خط کبھی مہینہ دو مہینہ میں آجاتا۔ اور کبھی وہ بھی نہیں۔ ظہیر کی عجیب کیفیت تھی۔ نہ کلاس میں اس کی طبیعت لگتی تھی۔ نہ ہوسٹل میں۔ لیکن اس خلفشار میں کمی کی بھی کوئی سبیل نہ تھی۔

ایک دن وہ بیٹھا ہوا نجمہ کے سب خط پڑھ رہا تھا۔ کہ ڈاکیہ نے نگہت کا خط لاکر دیا۔ اس نے لکھا تھا — میں ایک ہفتہ بعد تمہارے گھر جارہی ہوں اگر تم بھی آجاؤ تو اچھا ہو"۔ ظہیر نے لکھدیا: "میرا سالانہ امتحان شروع ہونیوالا ہے۔ ایسی حالت میں آنا نا ممکن ہے لیکن تم نجمی سے مل کر سب حال معلوم کرنا۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی اب تو عرصہ سے کوئی اس کا خط نہیں آیا۔ تم تو کچھ دن رہو گی میں امتحان ختم ہوتے ہی آؤں گا"۔

لیکن نگہت کا بھی کوئی جواب نہ آیا۔ ظہیر عجیب پریشانی میں تھا۔ کیا دونوں نے سازش کرلی۔ ادھر امتحان شروع ہونے والے تھے اس سے کچھ پڑھا نہ جاتا۔ بہرحال جیسے بھی ہو سکا اس نے امتحان دیا۔ جس دن آخری پرچہ کرکے نکل رہا تھا۔ اس دن اس کو نگہت کا خط ملا۔ اس نے لکھا تھا: "میں کئی دفعہ نجمہ سے ملی۔ لیکن واقعات ایسے تھے کہ تمہیں پہلے سے لکھنا مناسب نہ سمجھا ورنہ شاید تم امتحان بھی نہ دے سکتے۔ اب غالباً تمہارے امتحان ختم ہو گئے ہوں گے۔ کل واقعات تو ملنے پر بتاؤنگی۔ مختصر طور پر یوں سمجھو کہ نجمہ نے تمہیں دھوکا دیا۔ جب میں نے اس سے ملکر کل حال پوچھا تو کہنے لگی کہ ابا جان نے میری شادی ارشد سے ٹھہرادی ہے (ارشد نجمہ کا کوئی رشتہ دار ہے اور وہ بھی شاید علیگڈھ ہی میں پڑھتا ہے) اور اب میں بالکل مجبور ہوں۔ جب میں نے کہا کہ تم اپنی پسند کا حال کسی کے ذریعہ کھلوا کیوں نہیں دیتیں۔ تو وہ چُپ ہو گئی۔ اور جب میں نے کہا کہ اگر تم کہو تو میں تمہاری والدہ سے کہدوں کہ نجمی ارشد سے شادی کرنا نہیں چاہتی

تو وُہ ایک دم چونک گئی اور بولی کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ خلاصہ یہ کہ بعد میں معلوم ہُوا کہ نجمہ ارشد ہی کو پسند کرتی ہے اور تمہارے ساتھ تو بقول اس کے "شغلِ بے شغلی" تھا۔ باقی باتیں ملاقات پر۔"

ظہیر خط پڑھ کر سناٹے میں آ گیا۔ آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ جب چند منٹ میں حواس درست ہُوئے تو پھر خط پڑھا۔ "ارشد" اس کے دماغ میں ایکدم سے گونجا۔ اس کا کلاس فیلو اور دوست کہ سوائے اس راز کے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو ارشد کی ظہیر کو اور ظہیر کی ارشد کو معلوم نہ ہو۔ ظہیر نے سوچا کہ اگر مَیں نے پہلے ہی ارشد سے یہ بات بھی کہدی ہوتی تو وہ یقیناً اس کی خاطر اتنی قربانی گوارا کر لیتا۔ لیکن نجمہ کا "شغل بے شغلی" والا فقرہ ہتھوڑے کی طرح دماغ پر لگا۔ رگوں میں سنسنی ہونے لگی۔ تو گویا اس نے محض بے وقوف بنایا ——!

(۷)

ظہیر رات کی گاڑی سے گھر آ گیا۔ نگہت سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے سب بتایا کہ کس طرح وہ نجمہ سے ناراض رہی اس کو بُرا بھلا کہا۔ کہ اگر شغلِ بے شغلی ہی تھا تو اس قدر ربط ضبط کیوں بڑھایا تھا۔ وہ ظہیر سے بولی کہ تم اس کا خیال چھوڑ دو۔

"نگہت کیا کہتی ہو —— مَیں نجمی نہیں ہُوں —— مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا ——" ظہیر نے ڈبڈباتی آنکھوں سے نگہت کو دیکھتے ہوئے کہا —— "نجمی نے جو کیا اچھا کیا —— بلکہ وہی کیا جو اس صنف کو کرنا چاہئے۔ لیکن ظہیر سے یہ ممکن نہیں۔"

نگہت :- لیکن ظہیر تم اپنی حالت بھی تو دیکھو زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ آخر

اب اس سے نتیجہ ہی کیا۔ ان گرمیوں کی چھٹیوں میں اس کی شادی بھی ہوجائیگی اس طرح آخر اپنی صحت گنوانے سے فائدہ۔"

ظہیر یہ سُن کر جیسے بجلی گر پڑی رہی سہی اُمیدیں بھی منقطع ہوگئیں۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

نگہت! تم نے ابھی تک مجھے سمجھا ہی نہیں۔ یہ کام نجمی کے لئے جتنا آسان تھا میرے لئے اتنا ہی مشکل ہے۔"

اگلے دن ظہیر کو ارشد کا خط ملا جس میں اس نے بغیر ملے چلے جانے کی شکایت کی تھی۔ اور لکھا تھا کہ اس مہینہ کی آخری تاریخوں میں میری شادی ہے۔ شادی کا دعوت نامہ بھی اس میں ملفوف ہے۔

ظہیر کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اپنی ملاقات اولین کے لمحات کا خیال کرتا تو حیرت ہوتی کہ یہ وہی نجمہ ہے۔ اس کو تعجب تھا کہ عورت کس قدر جلد رنگ بدل لیتی ہے کبھی سوچتا کہ خیر جو کچھ ہؤا اچھا ہؤا لیکن خود اس کی حالت برابر گرتی جا رہی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب کشمکش سی رہتی۔ کبھی سوچتا کہ جس طرح نجمی نے مجھے دھوکا دیا میں اس کا بدلہ لے سکتا ہوں۔ اگر میں ارشد سے سب حال کہدوں تو کیا ہوگا۔ مگر اس نے سوچا کہ یہ ارشد اور نجمی دونوں کے ساتھ ظلم ہوگا۔ نجمی تو خیر —— لیکن اس کا عزیز دوست ارشد آخر کس خطا میں یہ سزا بھگتے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ نجمی کے تمام خط ارشد کو دیدے اس طرح نجمی کی تمام مسرتیں حجلۂ عروسی میں ہی دفن ہوکر رہ جائیں گی۔ لیکن بیچارہ ارشد —— اس کی تمام زندگی جہنم بن جائیگی۔ شادی اب

رُک نہیں سکتی اور نجمہ کے محبت بھرے خط پڑھ کر اس کے دل میں نجمی کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ سکتی۔ پھر نجمی تو خیر —— لیکن ارشد پر کیا بنے گی۔ اِسی طرح وہ گھنٹوں انہیں خیالات میں غرق رہتا۔ کبھی مضطوطی سے بند دریچہ کیطرف بے مطلب تکا کرتا۔

دوسری طرف نجمہ کی حالت عجیب تھی۔ وہ اپنی اِس حرکت پر متاسف تو یقیناً نہ تھی۔ لیکن جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ارشد ظہیر کا کلاس فیلو اور عزیز ترین دوست ہے تو اس کی آئندہ مسرتوں کی دلکش عمارتیں منہدم ہوتی نظر آنے لگتیں۔ وہ سوچتی کہ اگر ظہیر نے ارشد کو بتا دیا تو —— لیکن ظہیر ایسا نہ کریگا۔ مگر کیوں نہیں کرے گا —— اگر مَیں اس کی جگہ ہوتی تو —— تو...... اگر اس نے ارشد کو خط دکھا دیئے تو مَیں کہیں کی بھی نہ رہونگی۔ مَیں نے اس کے تمام خط جلا دیئے ہیں کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے لیکن ظہیر کے پاس تو ہونگے —— اگر اس نے ارشد کو دے دیئے تو —— !" اس خیال ہی سے اِس کے تخیل پر اندھیرا چھا جانے لگتا۔

شادی کی تاریخیں برابر قریب آ رہی تھیں۔ ارشد کے بھی خط آتے تھے کہ تمہیں ضرور شریک ہونا پڑے گا۔ جب بھی ارشد کا خیال آتا تو ظہیر کی آنکھوں میں انتقام کی چمک پیدا ہو جاتی —— کیوں نہ میں بھی بدلہ لوں —— صرف ارشد کو خط ہی دکھا دینے کافی ہیں۔ لیکن پھر وہ سوچتا ؎

نادیدہ جورِ اُو زِ وفا لافہا زدم
آساں نبُود ترکِ ستائشِ ستودہ را

اُدھر نجمہ بھی ایک ذہنی خلفشار میں مُبتلا تھی۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ ظہیر

یقینی ارشد کو خط نہ دکھائے گا۔ لیکن پھر سوچتی اگر دکھا دیئے تو —— وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح ظہیر اس کے خط واپس کر دے کئی دفعہ اس نے نگہت سے بھی کہنا چاہا لیکن اوّل تو اس نے آنا جانا ہی بہت کم کر دیا تھا پھر اس کی مغموم آنکھیں اور اُترا ہُوا چہرہ دیکھ کر نجمہ کی ہمت نہ پڑتی کہ ظہیر کے متعلق بات کرے۔

شادی کی تاریخیں جتنی قریب آتی جاتیں دونوں کی اضطراری کیفیت بڑھتی جاتی۔ ایک کی نگاہیں مستقبل کی طرف تھیں دُوسرا ماضی کے حسین خوابوں میں گُم۔ ظہیر میں کبھی تو جذبۂ انتقام ایک دم بھڑک اُٹھتا اور وُہ فیصلہ کر لیتا کہ وُہ ارشد سے سب حال کہدیگا۔ لیکن پھر تخیل نجمہ کی مُسکراتی ہُوئی آنکھیں پیش کر دیتا۔ اور وہ جذبہ سرد پڑ جاتا۔ اُدھر نجمہ کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ ظہیر اس کے خط واپس کر دے۔

اسی کشمکش اور بے چینی میں دن گزرتے گئے۔ اور یہاں تک کہ شادی کی تاریخ بالکل قریب آ گئی۔ ظہیر کے دماغ میں وہی ایک سوال گردش کر رہا تھا —— یکا یک اس کو نجمہ کا "شغل بے شغلی" کا فقرہ یاد آیا۔ دماغ میں سینکڑوں چیونٹیاں کاٹنے لگیں۔ تمام چہرہ ایک دم سُرخ ہو گیا۔ کان جھنجھنا اُٹھے۔ "ہوں" اس نے نیچے کا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہُوئے کہا "شغل بے شغلی" اور خواہ مخواہ اپنی اُنگلیاں توڑنے لگا۔

"چاہے کچھ بھی ہو" اس نے دل میں فیصلہ کیا "مَیں ضرور ارشد سے سارا حال کہدُونگا اور خط بھی دیدُونگا جنہیں وہ بطور تحفۂ رُونمائی پیش کر سکے"۔

"تحفہ رونمائی!" اس کے دماغ میں ایک دم پھر گونجا —— کل شادی ہے —— نجمی کی —— مجھے بھی کچھ تحفہ پیش کرنا چاہیئے۔ مگر وہ قبول بھی کریگی ——! اس نے سوچا "مگر تحفہ کیا ہو" وہ دیر تک سوچتا رہا۔ مختلف چیزیں ذہن میں آئیں —— پھر نہ معلوم کیا خیال آیا کہ چہرہ یکایک دمکنے لگا۔ لیکن پھر رنگت مدھم پڑ گئی۔ "ہاں ہاں یہی بہترین تحفہ ہوگا!" اس نے سوچا "مگر نجمی تک پہنچے کیسے —— نگہت کے ذریعہ ——!" وہ اٹھ کر یونہی ٹہلنے لگا اور تحفہ کی نوعیت پہ غور کرنے لگا۔

نجمہ کل کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کا دل خواہ مخواہ تیزی سے دھڑکتا جارہا تھا۔ تمام جسم میں ایک بے معنی لرزش خفی سی تھی۔ کل کے خیال سے —— کل یقیناً مطلعِ مسرت ہوگی لیکن —— اس کے خط —— اس کے خیال ہی سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کاش وہ واپس مل جاتے ——!"

اتنے میں نگہت داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ نامعلوم کیوں زرد ہو رہا تھا۔

"یہ ظہیر نے بھیجا ہے" اس نے نجمہ کی طرف ایک سُرخ ربن سے بندھا ہوا پیکٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شادی کا تحفہ ہے!"

نجمہ نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے پیکٹ کھولا۔ اوپر ظہیر کا خط تھا:-

"نجمی

کل تمہاری شادی ہے خدا مبارک کرے۔ میں نے سوچا کہ کیا تحفہ شادی پیش کروں۔ میرے پاس اب ہے ہی کیا۔ ایک دل تھا وہ پہلے ہی نذر ہو چکا۔ لیکن وہ بھی تمہاری ہی امانت تھا۔ اب تمہارے خط ہیں جو تمہارے

تصور کے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز ہیں لیکن یہ بھی تمہاری ہی امانت ہیں۔ اگر ان کو ضائع کر دیا تو تم غالباً یقین نہ کرتیں اس لیے یہ تمہاری ہی نذر ہیں۔

محروم تمنا

"ظہیر"

نجمہ کی آنکھوں سے دو گرم گرم آنسو نکل پڑے نہ معلوم کس جذبہ کے ماتحت ——— !

خلش

وہ دیر سے کتاب پڑھ رہی تھی۔ پڑھ کیا رہی تھی۔ کتاب پر نظریں جمائے ہوئے تھی دماغ میں ایک عجیب خیال گھوم رہا تھا۔ کئی دن سے اس کے دماغ میں ایک نامعلوم سی چبھن تھی۔ ایک خلش تھی جو اسے دماغ کے گوشے گوشے میں محسوس ہوتی تھی۔ صرف دماغ ہی میں نہیں بلکہ دل میں اور سارے جسم میں۔ ایک غیر متعین سی خلش۔ اس کا بے اختیار جی چاہتا تھا کہ زور سے سر کو دیوار سے دے مارے۔ تاکہ دماغ پاش پاش ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی اس خیال کا وجود بھی نہ رہے۔ یا وہ بھاگ جائے یہاں سے۔ دور بہت دور۔ ایسی جگہ جہاں اس کو یہ خیال پریشان نہ کر سکے لیکن یہ خیال تو اس کے تمام وجود پر چھا گیا تھا۔ ہر وقت ایک بے چینی کلبلاہٹ چبھن اور خلش۔

"اونہہ" اس نے عاجز آکر کتاب زور سے میز پر دے ماری۔ گویا وہ خیال اس کی ایک ہی ضرب سے پاش پاش ہو گیا۔ لیکن پھر بھی اسے ہر طرف وہی بکھرا ہوا نظر آیا۔ سامنے لگی ہوئی تصویر پر اس کی نظر ٹھہر گئی اس کو وہ مسکراتی ہوئی معلوم ہوئی۔ گویا اس نے اس کا خیال پڑھ لیا اور اس کی اس دیوانگی پر اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ پھر اٹھ کر ویسے ہی کمرے میں ٹہلنے لگی۔ کئی دفعہ تصویر کے قریب سے گزری۔ وہ ویسے ہی مسکرا رہی تھی یقیناً اس کی دیوانگی پر۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس تصویر کو دیکھ نہ سکے گی۔ وہ غیرارادی طور پر بڑھی اور تصویر کو اُلٹ دیا ——!

"اوہ —— خدایا کیا کروں!" وہ اپنا سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ کچھ بھی ہو آج ضرور ان سے کہہ دُونگی۔ وہ چاہے مجھے کچھ بھی خیال کریں۔ مگر اب میں برداشت نہیں کر سکتی اس کی آنکھوں سے جذبات پگھل پگھل کر بہنے لگے۔

اتنے میں ارشد داخل ہوا۔ اُسے کچھ پتہ بھی نہ چلا۔ ارشد نے اس طرح جو بیٹھے ہوئے دیکھا تو دبے پاؤں آیا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"ارے" وہ ایکدم اچھل پڑی "آ گئے آپ؟"

"تم رو رہی ہو پروین؟" ارشد نے اس کے دوپٹہ سے گلہائے شبنم زدہ پونچھتے ہوئے کہا "کیا بات ہے آخر؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ اور بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف اٹھا کر جھکا لیں۔

"کیا بات ہے پروین!" ارشد نے کہا "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تم نہ معلوم کیوں بے چین سی ہو۔ کیا جی گھبراتا ہے تمہارا؟"

"نہیں" اس نے پھر ارشد کی طرف دیکھا مگر نظریں نہ ملا سکی۔ "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

"مجھ سے؟" ارشد نے تعجب سے کہا۔ "بے — وقت — آخر وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے تم اتنی پریشان ہو؟"

"لیکن — لیکن —" نہ معلوم اس کا سر کیوں اور نیچے جھک گیا اور اپنی انگلیاں مروڑتی ہوئی بولی۔ "لیکن آپ مجھے کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو پروین؟" ارشد کچھ نہ سمجھ سکا۔

"دیکھیے —" اس کی حنائی انگلیاں ایک دوسرے سے اُلجھ کر رہ گئیں اور دماغ میں وہ خیال بھی اُلجھ گیا — "دیکھیے — مجھے کل سے امی — بہت یاد آرہی ہے۔"

"ارے"۔ ارشد قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ "بس اتنی بات تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے میں کل ہی چھٹی کی درخواست دے دونگا۔"

پروین اسی طرح انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ چہرہ پہ وہی ہیجانی کیفیت اور کرب کے آثار تھے۔

"بس اب تو ہنس دو"۔ اس نے اس کی انگلیاں چھڑا کر ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "ان بے چاریوں نے کیا قصور کیا ہے۔ جو توڑے جاتی ہو ان کو"۔ اس نے بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

(۲)

پروین ارشد سے وہ بات نہ معلوم کیوں نہ کہہ سکی۔ لبوں پر آکر رُک گئی اور بات بنا دی لیکن اس بات بنانے نے اس کی جان پر بنا دی۔ دماغ میں ہر وقت

جیسے سیکڑوں انجن چل رہے ہوں۔ دماغ میں سیکڑوں سوئیاں ایک ساتھ گھس گئی ہوں۔ وہی بے چینی۔ روحانی چبھن۔ ایک کرب۔ ایک نزع کی سی کیفیت۔ چائے کی پیالی اس نے اس زور سے رکھی کہ چٹخ گئی۔ چائے کے گھونٹ گویا رقیق پھانسیں بن کر اس کے حلق سے اتر رہے تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ روئے اور خوب روئے۔ یہاں تک کہ اس کا خیال۔ اس کا وجود یہ زمان و مکان سب ختم ہو جائیں۔

"میں اب یہ کٹھن نہیں سہہ سکتی" اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ کر بند کیں اور زور سے پیر پٹخے۔ اس کی شادی کو ابھی پندرہ دن بھی نہ گزرے تھے۔ وہ ارشد کے ساتھ محبت سے زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک خیال جو نہ معلوم اس کے دماغ کے کن گوشوں میں پوشیدہ تھا یکایک آ کودا۔ وہ بات اس کے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پندرہ برس سے اس عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ ارشد سے کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکتی تھی۔ اس گومگو نے اس کی زندگی کا سکون دماغی انتشار میں تبدیل کر دیا تھا۔ مگر اب وہ اس کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

شام کو ارشد دفتر سے لوٹا تو وہ بولی "مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

"کچھ یاد آ رہی ہوگی" ارشد نے ہنس کر کہا۔

"نہیں ——— ایک راز ——— میری زندگی کا ——— عزت کا" وہ اٹکتے ہوئے سب کچھ کہہ گئی۔

"راز ——— زندگی۔ عزت۔ کیا ہو گیا ہے۔ پروین تمہیں کئی دن سے" ارشد نے اس کی طرف متشکک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ نے دیکھے ہوں۔ میرے افسانے اکثر رسالوں میں نکلتے رہے ہیں۔"
پروین نے اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر"

"ایک دن مجھے ایک خط ملا۔ اس میں میرے افسانوں کی بہت تعریف تھی۔ اور مجھ سے خط و کتابت جاری رکھنے کی درخواست کی تھی" اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ الجھنوں سے رنگین ہو گیا ہے۔

"پھر"

"مجھے ان خطوں سے خلوص کی بو آتی تھی۔ میں نے بھی اس سے خط و کتابت جاری رکھی۔ یہ بہت دن تک رہی۔ مجھے اس کی باتوں سے سچی محبت کی بو آتی تھی بالکل جیسی آپ کی باتوں سے آتی ہے۔"

"تو پھر تم نے بھی اسے پُر محبت خط لکھے"۔

"ہاں ہماری خط و کتابت بہت دن تک جاری رہی"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ارشد کی طرف دیکھا۔ مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

"تو تم اس سے محبت کرتی تھیں ——" ارشد نے ایک عجیب لہجے میں کہا۔

"ہاں" اس کے منہ سے ایک دبی ہوئی آواز نکلی "مگر میں نے اس کو کبھی دیکھا نہیں"

"تو تم اس سے محبت کرتی تھیں۔ بالکل ایسی ہی جیسی اب مجھ سے کرتی ہو۔" ارشد نے یہ کہا اور اٹھ کر اپنی میز کے قریب گیا۔

پروین کچھ جواب نہ دے سکی۔ شاید ارشد ناراض ہو گیا۔ وہ اس کی نظروں سے گر گئی۔ اب اس کے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ سکتی۔ یقیناً۔ مگر خیر نہ

اس جانکنی کی تکلیف سے تو نجات پا گئی - وہ اپنے وجود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی - اس کی سب پھانسیں نکل چکی تھیں -

"تو تم واقعی اس سے محبت کرتی تھیں" ارشد نے معطر لفافوں کا ربن سے بندھا ہوا ایک بنڈل اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "انہیں پہچانتی ہو - ذرا دیکھنا ان کو"

اس نے ربن توڑ کر خط نکالے - لفافے اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر بکھر گئے فضا میں ایک ہلکی سی معطر خوشبو پھیل گئی -

"تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا تھا" اس نے اپنا منہ گھٹنوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "تمہیں معلوم نہیں مجھے اب تک اس بات کی وجہ سے کیا روحانی اذیت برداشت کرنا پڑی ہے — ہٹو یہاں سے — میں نہیں بولتی تم سے —"

عورت

بہت زمانہ گذرا چین کے ایک قصبہ میں چیانگ نامی ایک فلسفی رہتا تھا بہت سے اور فلسفیوں کی طرح اس کو بھی اپنی پہلی شادی کا تجربہ کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ پہلی بیوی شادی کے کچھ دنوں بعد ہی داغِ جدائی دے گئی - دوسری بیوی کے

ساتھ اسکی بن نہ سکی اور جلد ہی طلاق دینی پڑی۔ تیسری بیوی کیساتھ البتہ اس کو وہ تمام مسرتیں میسر تھیں جن سے وہ پہلے محروم رہ چکا تھا۔

دوسرے فلسفیوں کی طرح وہ بھی دیر تک اپنے خیالات میں غرق ٹہلنے کا عادی تھا۔ ایک مرتبہ وہ ایسے ہی ٹہلتا ہوا ایک نئی قبر کے پاس سے گذرا جس کے پاس ایک حسین عورت ماتمی لباس میں بیٹھی ہوئی قبر کو پنکھا جھل رہی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ پھر وہ ٹھہرا فلسفی۔ چنانچہ وہ اس عورت کے پاس گیا اور بولا "میں پوچھ سکتا ہوں آپ کیا کر رہی ہیں"۔

"یہ میرے شوہر کی قبر ہے"۔ اس نے بڑی بڑی آنکھیں فلسفی پر جماتے ہوئے کہا۔ "مرنے سے پہلے اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس وقت تک دوسری شادی نہ کرونگی جب تک اس کی قبر کی گیلی مٹی خشک نہ ہو جائے۔ میں کئی دن تک انتظار کرتی رہی لیکن یہ خشک ہی نہیں ہو چکتی اب میں اس لئے پنکھا جھل رہی ہوں کہ یہ جلدی سے خشک ہو جائے"۔

بات ختم کرنے کے بعد اس نے پھر فلسفی کی طرف دیکھا۔ اسکی حسین آنکھیں فلسفی جیسے خشک آدمی پر بھی اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

"آپ کی نازک کلائیاں اس کام کے لئے موزوں نہیں۔ لائیے مجھے دیجئے پنکھا"

"اگر آپ قبر کو جلد خشک کردیں گے تو میں بہت مشکور ہوں گی"۔ اس نے پنکھا دیتے ہوئے کہا۔

وہ پنکھا لیکر قبر کو جھلنے لگا اور اپنی روحانی قوت سے تمام نمی تھوڑی دیر میں کھینچ لی اور قبر بالکل خشک ہو گئی۔

وہ حیرت سے یہ بات دیکھ رہی تھی - اتنی جلدی قبر خشک ہو جانے سے اسکو بہت مسرت ہوئی اور بولی "میں آپ کی بہت ممنون ہوں - آپنے میری مصیبت کو ہلکا کر دیا - میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں - اظہار تشکر کیلئے میں یہ پنکھا اور ہیئر پن نذر کرتی ہوں - ازراہ کرم اسے شرف قبولیت بخشئے" یہ کہکر اس نے پنکھا اور چاندی کی ہیئر پن پیش کی - فلسفی نے پنکھا تو لے لیا لیکن ہیئر پن شادی کی اپنی بیوی کے خوف سے نہ قبول کر سکا - اور اس نے انکار کر دیا - لیکن اس واقعہ نے اس پر خاص اثر ڈالا اور وہ عام عورتوں کی سیرت کو ایک نئے زاویے سے سوچنے لگا - اس کے دل پر اس واقعہ کا کافی اثر تھا اس لئے جب وہ اپنے کمرہ میں خیالات میں غرق واپس ہوا تو ایک ٹھنڈی سانس اس کے منہ سے نکل ہی گئی - اتفاق سے اس کی بیوی بھی اسی وقت کمرہ میں داخل ہوئی -

"کیا بات ہے آج بہت ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر رہے ہو" اس نے فلسفی کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا - "یہ پنکھا کیسا ہے"

چیانگ نے کُل قصہ سُنایا - جب وہ کہہ چکا تو اس کی بیوی جو بڑے غور سے سُن رہی تھی غصہ میں بولی "وہ کمبخت عورت صنفِ نازک کیلئے باعث صد شرم ہے - خدا اسے غارت کرے - خود اس کو پہلے کیوں نہ موت آگئی"

چیانگ یہ سُن کر فلسفیانہ انداز میں مسکرایا اور مشہور ضرب المثل سُنادی

"لوگوں کے دل کا حال چہرہ سے نہیں معلوم ہو سکتا"

"تم کس طرح سب عورتوں کو بُرا کہہ سکتے ہو؟ وہ بولی "سب اس بے شرم کی طرح نہیں ہوتیں تم خود ایک طرح سے میری اور میری صنف کی توہین کر رہے ہو"

"اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے"۔ چیانگ نرمی سے بولا۔ "اچھا تم خود بتاؤ کہ اگر میں مر جاؤں تو کیا تم اس تمام حسن و جوانی کے ساتھ پانچ یا صرف تین برس بھی بیوہ رہ سکوگی؟"

"جس طرح ایک وفادار وزیر دو بادشاہوں کی خدمت نہیں کر سکتا اسی طرح ایک شریف عورت بھی دوسرے شوہر کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتی۔ اگر خدانہ کرے ایسا ہو جیسا تم کہہ رہے ہو تو تین یا پانچ کی ضرورت نہیں ہیں تمام عمر اسی طرح زندگی بسر کر دوں گی"۔

"مشکل ہے"۔ اس کا شوہر بولا "بہت مشکل ہے"۔

"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ" اس کی بیوی بولی۔ "عورتیں بھی مردوں کی طرح بے انصاف اور سنگدل ہوتی ہیں۔ بیوی کی موت گھٹنی کی چوٹ۔ آج مری کل دوسری کر لی۔ اس کو طلاق دی اُس سے نکاح کر لیا"۔ اس نے فلسفی پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہماری تمام زندگی صرف ایک ہی کے خیال میں کٹ جاتی ہے ہم کیوں بیکار باتیں میرے چڑھانے کو کرتے ہو"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

"زیادہ ناراض نہ ہو"۔ چیانگ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے اُمید نہیں کہ شاید تم وقت آنے پر ایسا کرو"۔

اس واقعہ کو کچھ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ چیانگ بیمار ہو گیا۔ اور روز بروز حالت خطرناک ہوتی گئی۔ تو ایک دن اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "پیاری میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تمہیں خیرباد کہنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ خیر میں خوش

ہوں کہ تمہارے سامنے مر رہا ہوں۔ لیکن تم نے بُرا کیا کہ اس دن پنکھا توڑ دیا ورنہ اب وہ میری قبر خشک کرنے میں کام آتا اور تمہیں زیادہ زحمت نہ ہوتی۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "ایسے وقت میں ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ میں ابھی مر جاؤں گی تمہارے سامنے تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف سچ ہے۔"

"بس" چیانگ بولا "مجھے اس سے زیادہ کی خواہش نہیں۔ مجھے اب تمہارا اطمینان ہے —— آہ میری آنکھیں مدھم ہو رہی ہیں" ان الفاظ کے ساتھ ہی تکیہ پر بے جان ہو کر گر پڑا۔

اس نے نبض دیکھی اور جب یقین ہو گیا کہ وہ ختم ہو چکا ہے تو بے اختیار اس کی لاش سے لپٹ کر زور زور سے نوحہ و بکا کرنے لگی۔ ہفتوں اسے روتے ہوئے بغیر کچھ کھائے پیے گذر گئے۔ چیانگ جیسے عالم کی موت پر تمام لوگ اس کے پاس تعزیت کیلئے آئے۔ اور ہر طرح کی ہمدردی کرتے رہے۔

ایک دن جب چند معزز اشخاص رسمی تعزیت کے بعد اس کے پاس سے واپس ہوئے تو ایک نوجوان مع اپنے نوکر کے داخل ہوا۔ اس کا حسین چہرہ بالکل مانی کی شاہکار تصاویر کی طرح تھا۔ وہ آسمانی رنگ کے ریشمی لباس میں تھا سیاہ ٹوپی لگائے ہوئے تھا۔ نوکر نے کہا کہ یہ سلطنت ڈسو کے شہزادہ ہیں۔ شہزادہ بولا:-

کچھ سال ہوئے میں نے چیانگ کی خدمت میں درخواست بھیجی تھی کہ وہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیں۔ اسی غرض سے میں آیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم کر کے سخت

صدمہ ہوا کہ وہ انتقال کر گئے"۔

یہ کہکر اس نے فوراً ماتمی لباس پہن لیا اور انتہائی عقیدت کے ساتھ تابوت کے سامنے چار مرتبہ سجدہ کیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا" آہ میرے استاد میں انتہائی بدقسمت ہوں کہ آپ سے براہِ راست استفادہ حاصل نہ کر سکا لیکن میں دل میں آپ کو استاد تسلیم کر چکا ہوں۔ اس لئے میں ماتمی مدت پوری کرنے کیلئے سو دن تک یہاں رہوں گا اور ماتم کرونگا"۔

یہ کہکر اس نے پھر سجدہ کیا۔ تمام زمین اس کے آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس نے چیانگ کی بیوی سے درخواست کی کہ وہ اس کو تعزیتی رسوم ادا کرنے کی اجازت دے۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ رواج کے مطابق حکماء کی بیویوں کو اپنے شوہروں کے شاگردوں سے پردہ نہیں کرنا چاہئے تو وہ مجبور ہو گئی شہزادہ نے تعزیتی رسوم ادا کیں۔ وہ نیچی نظریں کئے بیٹھی رہی۔ جب شہزادہ ختم کر چکا تو اس نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ شہزادے کی خوبصورتی دیکھ کر وہ متحیر رہ گئی۔ اس کے حسن سے وہ اس قدر متاثر ہوئی کہ علاوہ دلچسپی کے اور بھی خواہشیں اس کے جوان دل میں کروٹیں لینے لگیں۔ آخر اس نے شہزادے سے کہا کہ جب تک آپ یہاں رہیں۔ میرا مکان حاضر ہے۔ شہزادہ راضی ہو گیا۔ اتنے کے بعد اس نے شہزادے کو وہ کتابیں دیں جنہیں اس کا مرحوم شوہر اکثر پڑھا کرتا تھا۔ شہزادہ روزانہ باقاعدہ تابوت کے پاس ماتمی رسوم ادا کرتا۔ وہ بھی اکثر شریک ہو جاتی۔ اس طرح اکثر نظریں ملتی رہتیں۔ کچھ گفتگو بھی ہو جاتی۔ یونہی نظریں ملتے ملتے دل بھی مل گئے۔ اب ماتم کم اور بے تکلفی زیادہ ہونے لگی۔ یہ صاف ظاہر

تھا کہ شہزادہ بھی اس کی طرف کچھ مائل تھا اور وہ تو اس سے محبت کرنے لگی تھی ایک دن اس نے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کے نوکر کو بلایا۔ پہلے تو نوکر کو اچھی طرح شراب پلائی پھر پوچھا کہ کیا شہزادہ شادی شدہ ہے۔

"میرا آقا" نوکر نے جواب دیا۔ "ابھی تک کنوارا ہے۔"

"پھر وہ کس قسم کی عورت کو اپنا شریک حیات بنانا پسند کریگا۔" اس نے پوچھا۔

"میرا مالک کہتا ہے"۔ نوکر نے جواب دیا۔ جو خوب شراب پی چکا تھا۔ "کہ اگر کوئی آپ کی طرح حسین مل جائے تو وہ شادی کرے گا۔"

"کیا واقعی اس کا یہ خیال ہے۔" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ "مجھ سے تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔"

"کیا ممکن ہے کہ مجھ جیسا بوڑھا آدمی آپ سے جھوٹ بول سکے۔"

"اگر واقعی ایسا ہے تو کیا تم اسے شادی کے متعلق گفتگو کر سکتے ہو؟"

"میں اس سے گفتگو کر چکا ہوں" بوڑھے نوکر نے جواب دیا۔ "اور وہ بالکل تیار ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ میں نے اپنے اُستاد کی بیوی سے شادی کی۔"

"لیکن حقیقتاً" تو وہ میرے شوہر کا شاگرد نہیں ہے۔"

"جب یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا تو نوکر نے کہا کہ میں گفتگو کروں گا اور جو حکم بھی جس وقت ملا آپ تک فوراً پہنچا دونگا۔"

جب نوکر چلا گیا تو وہ اُٹھ کر بیتابی سے ٹہلنے لگی۔ اس کا دل مسرت سے اُچھل رہا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دل میں آرہے تھے۔ وہ ٹہلتی ہوئی شہزادے کے کمرے تک پہنچی وہاں کواڑ سے کان لگائے کہ شاید نوکر اس کے

متعلق گفتگو کر رہا ہو۔ پھر ٹہلتی ہوئی تابوت کے پاس سے گذری۔ "ارے" وہ ایکدم ٹھٹک گئی۔ اس نے زور زور سے سانس لینے کی آواز سنی۔ "کیا مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔" لیکن اس نے غور سے دیکھا تو شہزادے کا نوکر شراب میں مست تابوت کے پاس ٹانگیں پھیلائے پڑا سو رہا تھا۔ اور کسی وقت وہ تابوت کی اس بے حُرمتی کو برداشت نہ کرتی لیکن اس وقت چشم پوشی ہی کر جانا مناسب معلوم ہوا دُوسرے دن اس نے نوکر سے اس کے متعلق باز پرس کرنا تو درکنار اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔ اس کے بیتابانہ سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ شہزادہ بالکل راضی ہے۔ لیکن اس کو صرف تین باتوں کی وجہ سے تامل ہے۔

"وہ تین باتیں کیا ہیں"۔ اس نے بے قراری سے پُوچھا۔

"پہلی تو یہ کہ تابوت کی کمرے میں موجودگی شادی کے رسُوم میں حارج ہوگی۔ دُوسرے یہ کہ مرحُوم چیانگ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ بھی ان سے محبت کرتی ہوں گی۔ اس لیے شہزادہ کو اندیشہ ہے کہ آپ اس سے محبت نہ کر سکیں گی تیسرے یہ کہ وہ اپنے ساتھ نہ سامان لائے ہیں نہ کافی روپیہ ہے اس لیے شادی کی رسوم ادا کرنا مشکل ہے۔"

"یہ باتیں کچھ ایسی نہیں جو ہماری شادی میں حارج ہو سکیں۔ میں تابُوت کو گھر کے پچھواڑے اصطبل میں رکھوا دُونگی۔ دُوسری بات کے متعلق یہ ہے کہ میرا شوہر ایک بڑا فلسفی ضرور تھا لیکن کسی طرح بھی ایک اچھا آدمی نہ تھا۔ اس نے پہلی بیوی کے مرتے ہی دُوسری شادی کر لی اور اسے بھی کچھ دن کے بعد طلاق دیدی۔ مرنے سے کچھ دن پہلے وُہ ایک بیوہ سے محبت کرنے لگا تھا جو اس کو

کسی قبر کے نزدیک ملی تھی۔ اس لئے تمہارے شہزادے کو میری محبت پر کسی قسم کا شک نہ ہونا چاہیئے۔ رہا روپیہ کا سوال تو وہ بھی کچھ ایسا نہیں ہے۔ میں چاندی کے بیس ٹلیس تو فوراً دے سکتی ہوں اور غالباً یہ لباس وغیرہ کیلئے کافی ہونگے۔ تم فوراً شہزادے کے پاس جاؤ اور اس سے یہ سب باتیں کہو اور یہ بھی کہنا کہ آج سے زیادہ خوشگوار دن شاید پھر نہ آئے اسلیئے اگر آج ہی شام کو شادی کی رسوم ادا ہو جائیں تو بہت اچھا ہو۔ نوکر بیس ٹلیس لیکر شہزادے کے پاس گیا اور فوراً لوٹ کر آیا اور بولا شہزادے کو سب باتیں منظور ہیں اور وہ شادی کے لیئے تیار ہیں۔"

وہ یہ خبر سنتے ہی شادی کی تیاری کرنے لگی۔ اپنا ماتمی لباس بدلا۔ رخساروں کو گلابی کیا، نازک لبوں کو لالہ رنگیں بنایا۔ شادی کا لباس پہنا اور کچھ گاڑی والوں کے ذریعہ تابوت اٹھوا کر اصطبل میں رکھوا دیا۔ تمام گھر کو آراستہ کرنے کا حکم دیا۔ ہال میں قمقمے اور رنگ برنگی روشنیاں جلائی گئیں۔ اور خود شہزادے کے استقبال کیلئے تیار ہو گئی۔ شہزادہ اپنے شاہانہ لباس میں داخل ہوا۔ وہ شادی کے نشہ میں چور شہزادے کی بغل میں جا کھڑی ہوئی۔ دونوں شادی کی مقدس روشنی کے نیچے کھڑے ہوئے۔ جب رسوم ادا ہو چکیں تو وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے حجلۂ عروسی کی طرف چلے۔ دونوں ابھی کمرے میں داخل ہی ہوئے تھے کہ شہزادہ کپکپانے لگا۔ اس کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ بھنویں تن گئیں۔ دھڑ سے زمین پہ گر پڑا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرنے لگا۔

وہ ایکدم ڈر گئی۔ پھر اسے چمٹ کر خوب پیار کیا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ ملا لیکن جب اس سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہوا تو شہزادے کے نوکر کو بلایا اور پوچھا۔

"کیا تمہارے مالک کو ایسے دورے اس سے پہلے بھی ہوئے ہیں"۔

"اکثر" بوڑھے نوکر نے جواب دیا "اور کوئی دوا فائدہ نہیں کرتی سوائے ایک کے"۔

"وہ کیا ہے" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"آدمی کا بھیجہ شراب میں اُبلا ہوا" اس نے جواب دیا "جب کبھی تو سو میں ایسے دورے پڑتے تھے تو اسکا باپ بادشاہ کسی آدمی کو قتل کرا دیتا اور دوا تیار ہو جاتی لیکن یہاں کیسے دوا بن سکتی ہے"۔

"کیا کسی ایسے آدمی کا بھیجہ کام نہیں دے گا جو اپنی طبیعی موت سے مرا ہو" اس نے پوچھا۔

"ہاں اگر اسے مرے ہوئے آنچ اس دن نہ گذرے ہوں"۔

"تب تو میرے شوہر کا بھیجہ کام دے جائیگا۔ اسے مرے ہوئے تین دن ہی گذرے ہیں۔ یہ ہی آسان بات ہے کہ تابوت کھول کر نکال لیا جائے"۔

"لیکن کیا آپ ایسا کرنا پسند کریں گی"! نوکر نے تعجب سے پوچھا۔

"اب میں اور شہزادہ میاں بیوی ہیں۔ ایک بیوی کا فرض ہے کہ وہ ہر طرح اپنے شوہر کی خدمت کرے۔ میں اپنے شوہر کے مقابلہ میں ایک لاش کا خیال کروں جو جلد ہی خاک میں تبدیل ہونے والی ہے"۔

یہ کہکر اس نے نوکر سے کہا کہ شہزادے کو دیکھتے رہنا اور خود ایک بڑا سا ہتھوڑا اور شکاری چاقو لیکر اصطبل گئی۔ وہاں روشنی کی اور تابوت کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ ہتھوڑے پر ہتھوڑا پڑنے لگا۔ آخر ڈھکنا کھل گیا۔ اس نے ڈھکنا ہٹایا اور لاش کو دیکھا۔ ہتھوڑا ایک طرف رکھدیا۔ اور چاقو اٹھایا۔ لیکن وہ دھاک سے

رہ گئی۔ چیانگ نے دو مرتبہ گہری گہری سانسیں لیں اور اٹھ بیٹھا۔ وہ ایکدم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ پڑا۔

"پیاری" فلسفی بولا "مجھے ذرا اُٹھنے میں تو مدد دو۔"

اس کے لئے سوائے تعمیل حکم کے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ فلسفی تابوت سے باہر نکل آیا۔ اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لالٹین اٹھائی اور ساتھ چلنے لگی۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ وہ کمرے میں کیا سین دیکھے گا۔" دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ شہزادہ اور اس کا نوکر دونوں غائب ہیں۔ موقع پاتے ہی اس نے اپنی صنف کی مشہور چالیں چلنا شروع کیں۔ بڑے پیار سے اور نرمی سے بولی۔ "پیارے تم انتقال کے دن سے لیکر آج تک میرے خیالوں میں بسے رہے۔ آج میں نے تمہارے تابوت میں سے کچھ آواز سُن کر خیال کیا کہ شاید پرانی کہانیاں سچ ہوں اور تمہاری رُوح بھی واپس آگئی ہو۔ اس لئے میں نے تابوت کھول کر دیکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا خیال سچ ثابت ہوا اور تم ایک دفعہ پھر میرے آغوش میں آگئے۔"

"تمہارا شکریہ پیاری" فلسفی بولا "لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم آج ماتمی لباس میں کیوں نہیں ہو۔ یہ کیسا خوبصورت لباس تم نے پہنا ہے۔"

جب میں تمہارا تابوت کھولنے گئی تو مجھے یقین تھا کہ میرا خیال سچ ہوگا اس لئے میں تمہیں ماتمی لباس میں لانے کی ہمت نہ کر سکی۔"

"لیکن میرا تابوت کمرے میں کیوں نہیں رکھا گیا۔ وہاں اصطبل میں کیوں ڈالدیا

گیا تھا"

اس بات پر وہ سٹپٹا گئی اور اس کی صنفی فطرت بھی جواب دے گئی فلسفی نے کمرے کی دوسری چیزوں پر نظر ڈالی۔ شراب، چاندی کے پیالے اور دوسری چیزیں جو شادی کے موقعہ پر ہونا چاہئیں نظر آئیں۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ اور اس نے شراب مانگی اس نے اپنی تمام نسائی عیاریوں سے کام لیتے ہوئے اسے گلاس پیش کیا اور مسکرادی۔ لیکن فلسفی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور اس کی پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو وہ کون ہیں؟"

اس نے ایکدم مڑ کر دیکھا اس کو یقین تھا کہ شہزادہ اور اس کا نوکر ہوگا۔ چنانچہ وہی دونوں تھے۔ پھر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن وہ غائب تھا۔ اس نے پھر پیچھے مڑ کر دیکھا وہ دونوں بھی غائب تھے۔ اب وہ سارا معاملہ سمجھ گئی کہ شہزادہ اور اس کا نوکر اس کے شوہر کے ہمزاد تھے۔ جن کو اس نے اپنی روحانی طاقت سے الگ شکل میں منتقل کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کا ہر حربہ بیکار جائیگا اور سارا راز فاش ہو چکا ہے۔ اس نے فوراً اپنی ریشمی چادر اتاری اور دروازے سے لٹکا کر پھانسی لگالی۔

جب وہ مر گئی تو چیانگ داخل ہوا اس کو تابوت میں رکھا اور گھر کو مع تمام اسباب کے آگ لگادی۔ اور خود کہیں سفر پر چلا گیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کہاں گیا لیکن ایک چیز یقینی ہے وہ یہ کہ اس نے پھر باقی تمام عمر شادی نہیں کی۔

بانسری والا

چاندنی پھیلی ہوئی تھی ماحول پہ ایک سرور انگیز نشہ چھایا ہوا تھا۔ نینا اپنے کمرے کی کھڑکی پر کہنیاں ٹکائے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بظاہر اسکی نظریں تالاب کی مرتعش لہروں پر مہ نو کے منتشر جلوؤں کی ضیا پاشی میں مدہوش تھیں لیکن اس کا دماغ کہیں اور تھا۔ وہ اپنے گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہی تھی جو فلمی تصویروں کی طرح اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ "کوشل" اس نے اپنے دل میں دہرایا۔ پہلے اس نام میں کتنی شیرینی تھی چاشنی تھی اس کو بار بار دہرانے میں کتنا لطف آتا تھا لیکن اب نہ معلوم کیوں اسے اس نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر وہ حق بجانب بھی تھی۔ وہ کوشل سے محبت کرتی تھی — اور دیوانہ وار محبت کرتی تھی۔ لیکن اس نے اسے دھوکہ دیا۔ مگر نہیں اس کا دل توڑ دیا۔ مگر نہیں یہ اس کو سزا ملی۔ کمار اس سے سچی محبت کرتا تھا۔ اس نے خود کمار کو دھوکا دیا۔" وہ ان باتوں پر غور ہی کر رہی تھی کہ دور سے اسے بانسری کی مست دھن لے سنائی دی۔ کوئی اس کا محبوب نغمہ بانسری پر الاپ رہا تھا وہی نغمہ جو اکثر کمار بجاتا تھا۔ بانسری کی آواز اس کے کانوں سے نہیں دل سے ٹکرائی ٹوٹے ہوئے دل کے تمام تار جھنجھنا اٹھے۔ اس کے خیالات کا رخ بدل گیا۔ اس کو وہ شام یاد آ گئی جب کمار سے ملاقات ہوئی تھی۔

"شام کو وہ اپنے چھوٹے بھائی کو گاڑی میں لیکر پارک میں ٹہلانے گئی تھی۔ وہ باغ کی روش پہ گاڑی لیئے ٹہل رہی تھی۔ کہ سامنے پھولوں کے کنج میں سے بانسری کی دلکش آواز سنائی دی۔ اس کا دل نہ معلوم کیوں اس طرف کھنچنے لگا۔ وہ کئی دفعہ گاڑی لیکر اس طرف گئی۔ لیکن کمار اپنے نغمہ میں خود ایسا مدہوش تھا کہ اس نے دیکھا تک نہیں۔ آخر وہ اس کے قریب ہی والی بنچ پہ بیٹھ گئی۔ کمار جب بانسری بجا چکا تو اس نے اِدھر دیکھا۔ ایک دوشیزہ کو یوں بیٹھا دیکھ کر کچھ چونک سا گیا۔ نینا نے موقع پا کر کہا:۔

"میں آپ کے کام میں مخل تو نہیں ہوئی"۔

"جی نہیں"۔ کمار نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کا یہ نغمہ بے حد پسند آیا اس لئے بغیر اجازت ہی میں سننے بیٹھ گئی"۔

"شکریہ آپ کا"! کمار مسکراتے ہوئے بولا۔" اس میں اجازت کی کونسی بات ہے۔ میں آپ کا بہت مشکور ہوں"!

"آپ کیا کرتے ہیں"! نینا نے سلسلۂ گفتگو آگے بڑھایا۔

"میں یہاں کالج میں پڑھتا ہوں۔ بورڈنگ ہاؤس میں رہتا ہوں" کمار نے کہا۔"آپ بھی کہیں پڑھتی ہیں"۔

"میں بی اے کی پرائیویٹ تیاری کر رہی ہوں"۔ نینا نے جواب دیا۔

اتنے میں اس کا بھائی رونے لگا۔ وہ اس کو لیکر کھڑی ہو گئی۔ اور کمار سے بولی۔

"آپ سے پھر ملاقات ہو گی؟"

"آپ کہاں رہتی ہیں"۔

"یہ میرا پتہ ہے" نینا نے اپنا پتہ دیتے ہوئے کہا۔ "میں روز اسی وقت پارک میں آتی ہوں اگر آپ بھی تکلیف کریں تو......"

"نہیں تکلیف کی کیا بات ہے یہ تو عین راحت ہے" کمار نے ہنستے ہوئے کہا۔

(۲)

دوسرے دن پھر وہیں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ کمار بھی بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ نینا اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اکیلی رہتی تھی اور کوئی تھا نہیں۔ ماں نے ابھی اِسے کالج میں بھی داخل نہیں کرایا کہ وہ چلی جائے گی تو دن بھر وہ اس کو اکیلا رہنا پڑے گا۔ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب شام ہو گئی تو دونوں چلنے کیلئے کھڑے ہوئے۔ نینا نے کہا۔

"کل آپ میرے ہاں آجائیے گا۔ شام کی چائے بھی وہیں پیجئے گا"۔

"تکلف کی کیا ضرورت ہے"۔ کمار نے کہا "میں ۶ بجے تک آجاؤں گا"۔

اگلے دن کمار ۶ بجے نینا کے گھر پہنچ گیا۔ خوبصورت مغربی وضع کا بنگلہ تھا۔ پائیں باغ میں نینا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ماں بھی تھی۔ کمار کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تینوں بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ نینا نے کہا

"مجھے انگریزی اور فلاسفی میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے اگر آپ کا حرج نہ ہو تو کسی وقت بتا دیجئے گا"۔

"ضرور" کمار نے کہا "جب آپ کہیں۔ میں ہر وقت حاضر ہوں"۔

"نہیں اگر آپ کا کچھ وقت ضائع نہ ہو تو" نینا نے کہا "کسی وقت سمجھا دیجئے گا۔"
"وقت ضائع ہونے کی آپ نے اچھی کہی" کمار ہنستے ہوئے بولا "مجھے اور اچھی طرح سے یاد ہو جائے گا۔"
"ارے آپ نے یہ پیڑی تو لی ہی نہیں" نینا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ہاں پھر کر لیجئے گا۔"
"اور یہ لیجئے" نینا نے دوسری پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا "یہ میں نے خاص طور پر آپ کے لئے بنائی ہے۔"
"شکریہ" کمار نے کہا۔
جب ناشتہ کر چکے تو کمار بولا "میں اب اجازت چاہتا ہوں اس وقت مجھے ذرا ضروری کام ہے۔"
"ارے" نینا بولی "آپ تو جیسے ......
"صرف چائے پینے آئے تھے" کمار نے ہنستے ہوئے بات کاٹ کر جملہ پورا کیا۔
"نہیں ...... " نینا مسکراتے ہوئے بولی "جیسے صرف منہ دکھانے آئے تھے۔"
"مجھے ضروری کام ہے اس لئے معافی چاہتا ہوں" کمار نے کہا۔ "پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔"
"بیٹا کبھی کبھی آتے رہا کرو" نینا کی ماں نے کہا "یہاں اکیلے میں جی گھبراتا ہے۔ نینا کو کچھ پڑھا بھی دیا کرنا۔"
"بہت بہتر" ۔ کمار نے جواب دیا۔
"تو پھر کب آیئے گا" نینا بولی۔

"کل حاضر ہوں گا۔" کمار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تو معافی چاہتا ہوں۔"

(۲۳)

کمار اب کالج سے اکثر نینا کے ہاں آجاتا۔ دونوں کبھی مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کبھی دونوں انگریزی یا فلاسفی پڑھتے۔ اس طرح دونوں کے دل میں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے لیے جگہ ہوتی گئی۔

امتحان کے دن قریب آگئے تو نینا نے کہا کہ آپ ہوسٹل سے اپنی کتابیں وغیرہ یہیں لے آیئے وہاں تو اچھی طرح پڑھائی بھی نہ ہو سکے گی اور یہاں میں بھی آپ کے ساتھ پڑھ لونگی۔

کمار نے بھی سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے ہوسٹل میں پھر بھی اُدھم رہتا ہے ہوسٹل سے وہ ضروری سامان اور کتابیں نینا کے یہاں لے آیا۔ دونوں امتحان کی تیاری میں لگ گئے۔ دن رات پڑھائی کرتے شام کو دونوں پارک میں ٹہلنے چلے جاتے۔ امتحان شروع ہو گئے تھے۔ دو ایک پرچہ بھی ہو گئے تھے۔ شام کو وہ اور کمار پارک میں چلے گئے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ اسی روش اور کنج پر آگئے جہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کافی تھک گئی تھی اس لیے کنج کے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہوا میں خنکی سی آگئی تھی۔ پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو آرہی تھی۔ نینا بولی: "آج تو آپ بانسری پر وہی نغمہ سنا دیجئے جو آپ اس دن بجا رہے تھے!"

کمار بانسری بجانے لگا۔ اس کو واقعی اس میں کمال حاصل تھا۔ بانسری کی

دلکش آواز ماحول کی سرور انگیز فضا میں مل کر ایک سحر سا کرنے لگی۔ وہ بڑی دیر تک بجاتا رہا یہاں تک کہ چاند نکل آیا۔ اور اس کی روپہلی کرنیں نینا کے چہرہ پہ پڑنے لگیں۔ وہ بالکل مدہوش ہو کر نغمہ سن رہی تھی۔ کمار نے بانسری رکھ دی اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسی نغمہ میں کھوئی ہوئی تھی۔ "نینا" کمار نے کہا۔

اس نے چونک کر کمار کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک پیغام تھا۔ پیمان تھا۔ عہد تھا۔ جو کمار نے صاف پڑھ لیا۔

"وعدہ کرتی ہو تم نینا؟" کمار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اور تم بھی" نینا نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"

"میں بھی وعدہ کرتی ہوں"

دونوں نے اس پیمان پہ مہر ثبت کی اور گھر کی طرف چل دیئے۔

(۴)

امتحان ختم ہو چکے تھے۔ پرچے دونوں کے اچھے ہوئے تھے۔ کمار اس خیال سے بیتاب تھا کہ یہ چھٹیاں نینا سے الگ کیسے کٹ سکیں گی۔ اور نینا اس وجہ سے افسردہ تھی کہ کمار اب گھر چلا جائیگا تو وہ کیا کرے گی۔

امتحان کو ختم ہوئے دو ہفتے گذر چکے تھے۔ کمار نے نینا سے کہا۔

"نینا اب اجازت دو تو میں گھر ہو آؤں۔ وہاں سب لوگ انتظار کر رہے ہونگے۔

"اب تو آپ کالج کھلنے پر آئیں گے"! نینا نے افسردہ لہجہ میں کہا۔
"ہاں اس سے پہلے تو مشکل ہے"۔ کمار نے کہا۔
"پھر کب جا رہے ہیں آپ"؟
"کل"۔
"اتنی جلدی" نینا نے کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

(۵)

چھٹیوں میں اس کی اور کمار کی برابر خط و کتابت ہوتی رہی۔ وہ اب محسوس کرنے لگی تھی کہ کمار سے الگ ہونا اس کے لئے مشکل ہے اور کمار کیلئے گو بالکل ناممکن سا تھا"۔ وہ انہیں خیالات میں مدہوش تھی کہ کھڑکی کا پردہ ہوا کے شوخ جھونکے سے ہل کر اس کے منہ پر لگا اور وہ چونک پڑی۔ اف وہ کب سے وہاں کھڑی تھی۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگیں بھی دکھ گئیں۔ سامنے تالاب کی لہریں چاند کی کرنوں کو آغوش میں لینے کے لئے مچل رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح آج نہ معلوم کیوں اس کی باہیں کمار کے آغوش کے لئے مضطرب تھیں۔ ہاں کمار کے آغوش کے لئے ــــــ "وہ کتنی منحوس شام تھی" وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور پھر سوچنے لگی: "جب کمار نے اپنے دوست کوشل سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ کوشل ایک بڑے آدمی کا لڑکا اور کمار کا دوست تھا۔ صورت، جسم و خوبصورتی کسی چیز میں بھی کمار کے برابر نہ تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ــــ اُف ــــ غضب کی آنکھیں تھیں۔ ایک دفعہ دیکھ کر پھر نظر نہ ملائی جاتی۔ ان رسیلی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس چمک ہی نے نینا کو چندھیا دیا۔ وہ چکا چوندھ میں برے بھلے کی

تمیز نہ کر سکی۔ کوشل اس کی زندگی میں چپکے سے داخل ہو گیا۔ اس کو احساس بھی نہ ہو سکا۔ اور جب احساس ہؤا تو تدارک امکان میں نہ تھا۔ کمار — بھولا کمار کوشل کو اب تک اپنا دوست ہی سمجھے جا رہا تھا۔ وہ خود بخود نہ معلوم کیوں کمار سے اب کھنچنے لگی۔ وہ دو مقناطیسی قوتوں کے درمیان میں تھی۔ دونوں اسے اپنی جانب کھینچ رہے تھے۔ لیکن ایک سے وہ خود کھنچ رہی تھی اور دوسرے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ کمار عرصہ تک کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ اب بھی اسے اپنا ہی سمجھ رہا تھا۔

ایک دن شام کو کمار آیا۔ اور اس سے سینما چلنے کو پوچھنے لگا۔ وہ حالانکہ خود جانا چاہتی تھی مگر درد سر کا بہانہ کر دیا۔ اس دن کمار کتنا افسردہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ خیال بھی نہ کیا۔ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا رویہ کتنا دلشکن تھا۔ پہلے وہ خود کمار کے ساتھ جانے کے لئے بہانے ڈھونڈا کرتی تھی اور آج — لیکن کمار کے جانے کے بعد جب کوشل آیا تو اس کا درد سر غائب ہو گیا اور سینما جانے کو تیار ہو گئی۔ راستہ میں کمار نے ان کو دیکھ لیا مگر قصداً اس طرح ٹال گیا جیسے دیکھا ہی نہیں۔ اسی طرح اور کئی موقعوں پر اس نے اپنے رویہ سے کمار پر ظاہر کر دیا کہ وہ محض ایک تفریح تھی — مذاق تھا جواب تک اس کے ساتھ تھا وہ آتا تو اس کو کوئی نہ کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا۔ لیکن کوشل کے آتے ہی وہ ٹھیک ہو جاتی۔

کمار بے چارہ بہت دل شکستہ ہؤا۔ وہ اس سے سچی محبت کرتا تھا لیکن اسکی خودداری یہ گوارا نہ کر سکی۔ وہ آج بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہو گا لیکن آخر

اس کے اس برتاؤ سے دل برداشتہ ہو کر وہ اپنے گھر واپس چلا گیا۔"

"کوشل ـــــ" اس کے دماغ کے سامنے مختلف تصویریں رقص کر رہی تھیں حال ماضی کی گہرائیوں میں گم ہو رہا تھا۔" کوشل سے وہ محبت کرنے لگی بالکل ایسی ہی جیسی کمار اس سے کرتا تھا۔ لیکن آہ ـــــ اس نے دھوکہ دیا۔ اپنے ماں باپ کی نارضامندی کی آڑ لیکر کیسا صاف دھوکہ دیا۔ مگر نہیں اس کو اپنے کیئے کا بالکل ٹھیک بدلا ملا۔"

اس نے کرسی کے تکیہ سے اپنی پشت لگالی اور سامنے دروازہ کو تکنے لگی۔ آج نہ معلوم اسے کیوں کمار کا بار بار خیال آ رہا تھا۔ کمار اب بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہوگا۔ یقیناً" اور وہ خود اب اندھیرے میں ٹھوکریں کھا کھا کر سیدھے راستہ پر آ گئی تھی۔ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ کمار کے بغیر وہ نہ رہ سکیگی۔ لیکن کمار ـــــ اب وہ کس منہ سے اس کے سامنے جائے گی۔ لیکن نہیں کمار اب بھی اس کا کمار بن سکتا ہے۔ لیکن وہ نہ معلوم کہاں ہوگا ـــــ اُف" شدت جذبات سے اسکے آنسو نکل پڑے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔ کتنے گرم تھے اس کے آنسو جیسے پگھلے ہوئے انگارے۔ شاید سوز دل ان کے بہہ جانے سے کچھ کمی ہو جائے ـــــ مگر نہیں آتش دل اور بھڑک رہی تھی۔ بانسری کا سُریلا اور مدہم نغمہ اب بھی ہوا کے سہارے آ رہا تھا۔ یہ نغمہ کتنا مشابہ تھا کمار کے نغمہ سے بالکل اسی طرح وہ بھی بجاتا تھا۔ اس کے کان پھر اسی آواز کے لئے بیتاب تھے۔ کاش یہی بانسری والا اور قریب آجائے۔"

(۶)

اگلے دن وہی بانسری والا پھر کھڑکی کے نیچے سے گذرا۔ نینا آواز سُنتے ہی بیقرار ہو گئی۔ یقیناً یہ کمار کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا مگر کمار —— وہ یہاں کہاں —— نہ معلوم کہاں ہو گا۔ وہ دیر تک آواز سُنتی رہی۔ نغمہ فضا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہا تھا۔ جب آواز بالکل بند ہو گئی تو وہ مسہری پر گر پڑی۔

روز اسی طرح بانسری والا بجاتا ہوا اس کی کھڑکی سے گذرتا۔ نہ معلوم کیوں اس کا شبہ یقین تک پہنچ گیا تھا کہ یہ کمار ہی ہو گا۔ ایک دن جب وہ اسی طرح گذر رہا تھا تو اس سے نہ رہا گیا اور بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اس کو بلا لیا۔ بانسری والا پہلے تو جھجکا پھر کچھ سوچ کر کمرے میں آ گیا۔

دونوں آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ نینا غور سے اس کے خط و خال دیکھ رہی تھی۔ داڑھی بڑھی ہوئی بال بڑھے ہوئے ناخن بڑھے ہوئے۔ نہ معلوم کون ہے۔

"فرمایئے حکم"۔ بانسری والے نے پوچھا۔

اس آواز پر نینا کچھ چونک سی پڑی۔ پھر سنبھل کر بولی "معاف کیجئے گا آپکو بہت تکلیف ہوئی ہیں روز آپ کی بانسری سنتی تھی۔ آپ روزانہ یہی ایک نغمہ بجاتے ہیں اور اتفاق سے مجھے بھی یہی نغمہ بے حد پسند ہے"۔

"شکریہ آپکا"۔ بانسری والے نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نینا کو آواز اور انداز سے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کمار ہی ہے۔ لیکن وہ خود اس سے کہلوانا چاہتی تھی۔

"آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں میں۔" نینا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں میں پیغام دل تھا بانسری والے نے اس سے نظریں ملائیں اور فوراً ہٹا لیں شاید وہ سب کچھ سمجھ گیا۔

"میرا نام پوچھ کر کیا کریں گی آپ"۔ اس نے ذرا افسردہ لہجہ میں کہا "آوارہ گرد" نینا کو اب یقین ہو گیا کہ وہ کمار ہی ہے۔ اس یقین کے ساتھ ہی اس کا دل بھر آیا۔ اور "کمار" کہکر اس کے قدموں پر گر پڑی۔ شدت جذبات سے بے اختیار ہو گئی برسوں کے بند ناسور کھل گئے۔ وہ حیران تھا جب اس نے دیکھا کہ راز افشا ہو ہی گیا تو "نینا" کہکر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ اور اس کو اٹھانے لگا۔

"میرے کمار"۔ نینا نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو"۔ کمار کا دل خود نہ سنبھلتا تھا۔ جذبات آنکھوں کی راہ پانی ہو کر نکل رہے تھے۔ نینا نے اس کی گردن میں باہیں ڈالدیں۔ وہ چاہتا ہی تھا کہ نینا کو پھر اپنے آغوش میں لیکر برسوں کے داغ دھو دے لیکن نہ معلوم کیا خیال آیا کہ ایک دم اس نے جھٹک کر نینا کو الگ کیا۔

"نینا" کمار نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں اس وقت ایک عزم تھا۔ نینا اس اچانک غیر متوقع رویہ پر متحیر کھڑی تھی۔

"سنو نینا۔ آج آٹھ برس ہو گئے ہیں برابر تمہاری پرستش کرتا رہا ہوں تم میرے مندر کی دیوی ہو۔ میں نے تمہیں پوجا ہے اور ہمیشہ اسی طرح پوجتا

رہونگا۔ میری زندگی کا سہارا صرف تمہارا خیال رہا ہے۔ میرے جیون کی نیا اسی کے سہارے چلی ہے اور چلتی رہے گی۔ میں آج بھی تم سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں جیسی کہ پہلے میں آج بھی تمہاری ہی عبادت کرتا ہوں۔ میری تمناؤں کا مرکز صرف تمہی ہو۔ میری تاریک زندگی کی روشنی صرف تمہی ہو۔ نینا تم اپنا عہدِ وفا نہ نبھا سکیں لیکن میرا سب کچھ صرف وہی ایک عہد ہے جو تم سے اُس دن پارک میں کیا تھا۔ مجھے تم سے بیوفائی کا گلہ نہیں اور نہ اس کا مجھے کچھ حق۔ تم نے جو کیا اچھا کیا۔ تم نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ مجھے اسکی شکایت نہیں تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میں اس کا شکوہ نہیں کرتا۔ لیکن تم نے میری خودداری کو ٹھیس پہنچائی ......!"

نینا ڈبڈبائی آنکھوں سے جو حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ مبہوت ہو کر اس کو تک رہی تھی ——— "میں آج تک ایک امید موہوم کے سہارے جیتا رہا ہوں۔ میری زندگی کے تلاطم میں صرف تمہاری یاد تمہارا خیال تمہارا ذکر میرا ساتھی رہا ہے۔ اور تمام عمر میں انہیں کے سہارے جیوں گا میری رگ رگ میں تمہاری یاد ہے۔ کمار جب بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے۔ لیکن تم نہ جب کماری بن سکیں اور نہ اب بن سکو گی۔ تم نے میری خودداری کو مجروح کیا یہ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ نینا! میں نے تمہیں بہت تکلیف دی۔ بہت وقت ضائع کیا اب مجھے اجازت دو۔"

——— بانسری والا کمرے سے باہر نکل گیا۔ نینا کچھ اس درجہ مدہوش اور مبہوت کھڑی تھی کہ اس کو احساس بھی نہ ہو سکا جب دور سے بانسری کی آواز سنائی دی تو چونکی دروازے تک دوڑی پھر کھڑکی میں سے جھانکا۔ مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ چاندنی کرنیں اب بھی موجوں کے سینہ پر مچل رہی تھیں ⁂

صلہ

کالج کے سہ ماہی امتحان قریب تھے۔ سب توجہ سے اپنی اپنی پڑھائیوں میں مصروف تھے۔ کلاس میں بھی پروفیسروں کے لیکچر کو توجہ سے سننے لگے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے نوٹس کی فکر تھی۔ جن کے پاس سب نوٹس موجود تھے انہیں اطمینان تھا اور جنہیں کلاس سے حاضری دیکر غائب ہو جانے کی مشق تھی وہ اب دوسروں کے نوٹس کی فکر میں تھے۔

انگریزی کا گھنٹہ تھا۔ سب لڑکے اور لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ پروین نے شیلا سے کہا "تمہارے پاس فلاسفی کے سب نوٹس ہیں؟"

"اوں ہوں" شیلا نے کہا "میں نوٹس لکھتی ہی کب ہوں۔ میرا تو جی الجھتا ہے لکھنے میں۔"

"تمہارے پاس ہیں ناہید!" پروین نے دوسری سے کہا اور پھر خود ہی بولی "مگر تمہارے پاس فلاسفی ہے ہی کب۔"

"فلاسفی کے نوٹس!" ناہید نے کہا۔ "اختر سے کیوں نہیں لے لیتیں۔ اس کے پاس سب ہوں گے ہر وقت کلاس میں لکھتا ہی رہتا ہے۔ اور وہ دیکھو" ناہید نے پروین کے کہنی مارتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہاری ہی طرف دیکھ رہا ہے۔"

"اختر سے" پروین نے کہا "مجھے تو جھجک معلوم ہوتی ہے اس سے مانگتے

ہوئے۔ کبھی منع کر دے۔"

"اور کلاس میں آنکھیں لڑاتے ہوئے جھجک نہیں معلوم ہوتی" ناہید جلدی سے بولی۔

"ادہو۔ جھجک معلوم ہوتی ہے تمہیں" شیلا نے کہا "کیوں بنتی ہو، تمہیں اور اختر سے جھجک ہو۔"

"سیدھی بیٹھو" پروین کچھ کھسیانی ہو کر بولی۔ "پروفیسر صاحب دیکھ رہے ہیں"

جب کلاس سے سب نکلے تو پروین اختر سے بولی۔

"آپ کے پاس نوٹس ہوں گے فلاسفی کے۔"

"جی ہاں کیوں نہیں" اختر نے کہا۔ "آپ کے پاس بھی تو ہوں گے"۔

"ہمارے پاس پورے نہیں ہیں"۔ پروین نے موقعہ پاکر کہا۔

"کیوں پورے کیوں نہیں ہیں"۔ اختر بولا "کلاس میں آپ چلبلاتی تو بہت ہیں نوٹس کیوں نہیں لکھنیں۔"

"ویسے تو میرے پاس لکھے ہوئے ہیں لیکن بیچ میں بیمار پڑ گئی تھی اس لئے بہت سے چھوٹ گئے ہیں۔" پروین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کچھ دن کیلئے اپنے نوٹس دیدیں تو مہربانی ہوگی۔"

"میرے پاس نوٹس تو سب ہیں۔ لیکن آپ جانتی ہیں کہ میں نوٹس لکھنے اور کھیلنے کے علاوہ کچھ کرتا نہیں۔ امتحان کے قریب پڑھا کرتا ہوں۔ اس لئے میں اب نوٹس پڑھنے شروع کرونگا۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ نہیں دیں گے۔" پروین نے شکستہ دلی سے کہا۔

"مطلب تک آپ بہت جلدی پہنچ جاتی ہیں"۔ اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نوٹس تو آپ لے جائیے مگر ذرا جلدی واپس کر دیجئے گا"۔

کالج دسہرہ کی تعطیل کے بعد کھلا تھا اختر دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہوسٹل سے کالج آ رہا تھا۔ کچھ فاصلہ پر پروین شیلا اور دوسری لڑکیاں جا رہی تھیں۔ پروین کی ساڑی کا کونہ قریب کی گلاب کی کیاری میں اُلجھ گیا۔ اس نے ابھی چھڑایا بھی نہ تھا کہ اختر نے فقرہ چست کیا۔ "گلوں سے خار اچھے ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں"۔

پروین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اختر سے آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر کچھ کہے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

شام کو کالج کے بعد جب دونوں ملے تو اختر نے کہا۔

"کہیئے چھٹیاں تو اچھی طرح سے گذریں"۔

"آپ کو کیا"۔ پروین نے کچھ تیزی سے کہا۔

"اوہو" اختر مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ تو کچھ ناراض معلوم ہوتی ہیں"۔

"یہ صبح آپ نے کیوں مجھ پہ فقرہ چُست کیا۔"

"اس فقرے پہ ناراض ہوگئیں آپ"۔ اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "معافی چاہتا ہوں"۔

"معافی کی ضرورت نہیں ہے لیکن دوسرے کے سامنے تو ذرا خیال رکھا کیجئے"۔ پروین بولی۔ "اس وقت جو آپ چاہیں کہیں لیکن جب شیلا وغیرہ ہوں تو ذرا خیال رکھا کیجئے"۔

"کیوں شیلا کا کیا ہے"۔

"وہ بعد میں تنگ کرتی ہے۔ سب لڑکیوں کے سامنے چھیڑتی ہے"۔

اختر:۔ "تو آپ چڑھتی کیوں ہیں۔ آپ بھی چھیڑا کیجئے"۔

پروین:۔ (بات ٹالتے ہوئے) اچھا وہ یونین کی ڈبیٹ میں آپ بول رہے ہیں"

اختر:۔ آپ بول رہی ہیں؟

پروین:۔ ارادہ تو ہے میرا۔

اختر:۔ تو میں مقابلہ میں شریک نہیں ہونگا۔

"کیوں"

"اسلئے کہ اگر میں بولا تو پھر" اختر نے شرارتاً ہنستے ہوئے کہا "آپ کو انعام نہیں ملے گا"

"جی ہاں" پروین چڑھ کر بولی "جیسے بولتے ہی بڑا اچھا ہیں آپ!

"جی نہیں اچھا تو بس آپ ہی بولتی ہیں۔ مگر پہلا انعام ہمیشہ مجھے ہی ملتا ہے۔ خدا جانے کیوں؟"

"تو ججوں کی بے ایمانی کا میرے پاس کیا علاج ہے"۔

"ہارنے والا اپنا الزام دوسروں کے ہی سر تھوپتا ہے"

"اچھا میں بہت برا بولتی ہوں"۔ پروین نے عاجز آکر کہا "تو پھر آپ کو کیا مطلب"

"ارے مطلب وطلب کچھ نہیں" ہنسکر آپ تو ذرا سی بات پر رو دیتی ہیں"۔

پروین (بناتے ہوئے) ہر وقت آپ کو تو سوائے بنانے کے اور کچھ کام ہی نہیں ہے"

پروین اختر کے پاس سے ہو کر اپنے ہوسٹل گئی۔ وہاں سب لڑکیاں ناشتہ کر کے فارغ ہو چکی تھیں۔ پروین جیسے ہی اپنے کمرے میں گئی۔ ناہید نے شیلا کو آواز دے کر کہا۔ "شیلا ذرا دیکھنا آپ تشریف لے آئی ہیں۔"

شیلا، ناہید، نرگس، نورا اور دو تین لڑکیاں اور ملا کے کمرے میں گھس پڑیں۔

"کہیئے" ناہید نے طنزاً پروین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو تو جھجک معلوم ہوتی تھی اختر سے بات کرتے ہیں۔"

"جھوٹی ہے زمانہ بھر کی۔" شیلا بولی۔ "ابھی دو گھنٹہ گپ لڑا کے آرہی ہے۔"

"دو گھنٹہ۔ اوفوہ!" پروین کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ "پیٹ بھر کر جھوٹ بول لو۔"

"تم تو دو گھنٹہ کو کہہ رہے ہو۔" نرگس نے چلبلا کر کہا۔ "شاید کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا جو یہ اختر سے تین چار گھنٹہ باتیں نہ کرتی ہوں۔"

اب گھنٹے جو دو سے تین اور تین سے چار ہوئے تو پروین جل گئی۔ نرگس سے بولی۔

"اچھا تو تم کیوں جلی مرتی ہو۔ تم بھی کر لیا کرو نا کسی سے باتیں۔"

"یہ فن تو بس تمہیں ہی آتا ہے۔" نرگس نے فقرہ چست کیا۔

پروین ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ ناہید بولی۔

"اختر صاحب میں ہے کونسی ایسی خوبی جس دن سوٹ پہن کر آتے ہیں اس دن تو بالکل چ۔غ۔د معلوم ہوتے ہیں۔"

"اور چال تو بالکل مار کھائے ہوئے گدھے کی سی ہے" فیلن نے ایک چٹکی لی۔

"تم تو چپ بیٹھی رہو!" پروین نے جواب ضرورت سے زیادہ کھسیانی ہو گئی تھی جلکر کہا "ذرا اپنے مسٹر واس کو دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی زو میں سے چھٹ کر آرہے ہیں!"

"مگر کچھ بھی ہو تمہارے اختر سے پھر بھی بہتر ہیں وہ"۔ نیلن بولی۔

"جی ہاں ضرور ہوں گے"۔ پروین بولی۔

"واس اختر سے کہیں زیادہ اچھا ہے" ناہید نے اپنی عادت کے مطابق ارملا کے چڑھانے کو کہا۔

"یہ تمہاری زیادتی ہے" نورا بولی جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی "اختر کی آنکھیں اور رنگ واس سے کہیں زیادہ بہتر ہے!"

"اچھا تو آپ بھی اختر پر دانت لگائے بیٹھی ہیں" شیلا نے فقرہ کسا۔ "ارملا اب ذرا تم نورا سے ہوشیار رہنا!"

"بھئی تم بڑی پاجی ہو شیلا!" نورا بولی "ارملا سے تم لڑوانے کی فکر میں ہو مجھے اپنے لئے تو ان دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں!"

"ہاں تمہیں کیوں پسند ہونے لگا ہے کوئی!" دھارطی بولی "تم تو اب اونچے ہاتھ مارنے لگی ہو، دیکھ لیا ہے ہم نے سب!"

"اونچے ہاتھ"! نورا ہنستے ہوئے بولی "وہ کیسے ہوتے ہیں"۔

"اب کیوں بنتی ہو"۔ دھارطی بولی "کہہ دیتی ہوں پھر سب کے سامنے مسٹر آرچی......"

نورا نے لپک کر اس کا منہ دونوں ہاتھوں سے بند کر دیا اور لگی گدگدانے۔

شیلا بولی۔ "ارے اُسے کیوں مارے ڈالتی ہو۔ مجھے معلوم ہے سب ....."
"اچھا وہ جو نئے لیکچرار آئے ہیں انگریزی کے" ناہید بولی۔ "واقعی نورا! تم نے ہاتھ تو اونچا مارا۔"
"کیوں بھئی یہ بات ہے" نرگس جلدی سے بولی۔ "جبھی کل انگریزی کی کاپی مسٹر آرچی کو دے رہی تھیں اور میں نے پوچھا تو کہہ دیا کہ ٹیوٹوریل کی بات تھی۔"
"کیوں نورا' اچھا تو اب یہ تھی ٹیوٹوریل کی بات" نرگس نے کہا۔
اب تو سب لڑکیاں پروین کو چھوڑ کر نورا کے پیچھے پڑ گئیں۔ نورا چڑھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔
"تم سب کی سب بہت بدتمیز ہو ذرا کسی سے بات کر لی اور پیچھے پڑ گئیں۔"
"ذرا بیٹھو تو سہی" پروین بولی "ناراض کیوں ہوتی ہو۔"
"نہیں نہیں اب میں جاتی ہوں تم سب بہت ویسی ہو....." نورا چلنے لگی۔
"کہاں چلیں"۔ نرگس بولی۔
"مسٹر آرچی تو سینما گئے ہوں گے" شیلا نے فقرہ چست کیا۔
"اب کل کرنا ٹیوٹوریل کی بات" نرگس نے ایک اور فقرہ کسا۔
نورا بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

(۴)

پروین اور اختر اکثر ملتے رہتے۔ کبھی کالج کے واقعات پر بحث ہوتی کبھی دوسری لڑکیوں پر تبصرے اور کبھی ایک دوسرے پر فقرے بازی کرتے۔ ہر ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوتے گئے۔

سالانہ امتحان نزدیک تھے۔ سب امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ پروین اچانک بیمار ہوگئی۔ اور ہوسپیٹل میں چلی گئی۔ اختر کئی مرتبہ اسے دیکھنے گیا۔ وہ تقریباً مہینہ بھر تک بیمار رہی۔ امتحان کے مشکل سے پندرہ دن رہ گئے ہوں گے جس دن وہ کالج واپس آئی اس دن شام کو اختر سے ملی۔ اختر نے طبیعت پوچھی تو بولی:۔

"طبیعت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اب تک کمزوری ہے۔ نہ زیادہ چلا پھرا جاتا ہے۔ نہ کچھ کام کیا جاتا ہے۔"

"چلنے پھرنے کی ضرورت کیا ہے؟ کالج سے چھٹی لیکر کچھ دن آرام کیجئے۔"

"آرام تو ہو جائے گا لیکن یہ امتحان جو سر پہ سوار ہے۔"

"امتحان!" اختر نے تعجب سے کہا۔ "امتحان دیں گی آپ"۔

"نہیں دونگی تو اور کیا کرونگی" پروین بولی "سب پڑھا پڑھایا مہینہ بھر میں ختم ہو گیا اور اب ذرا کتاب لیکر بیٹھتی ہوں تو چکر آتے ہیں۔"

"آپ امتحان ہی کیوں دیتی ہیں"۔ اختر نے صلاح دی۔ "پچھلے ریکارڈ پر آپ پاس ہو جائیں گی۔"

"پچھلا ریکارڈ ہی میرا کونسا اچھا ہے۔" پروین مایوسی سے بولی۔ "یہ امتحان تو دینا ہے اور پاس بھی کرنا ہے۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہے۔" اختر نے کہا "پندرہ دن میں آپ کیا کیا کریں گی"

"یہی تو میں سوچتی ہوں........"

"دیکھیے آپ میرے فلاسفی اور انگریزی کے نوٹس لے جائیے ان سے شاید کچھ آسانی ہو جائے۔"

"اور آپ کا جو نقصان ہوگا" پروین بولی۔ "میں آپ کا نقصان نہیں چاہتی۔"
"نہیں میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" "میں کتاب سے پڑھ لونگا۔ پھر بہت سا تو میں نے پڑھ بھی لیا ہے۔"
"اچھا اگر آپ کا کوئی حرج نہ ہو تو دید یجئے گا۔ اگرچہ پاس میں پھر بھی نہیں ہو سکتی۔ پندرہ دن میں کیا کیا کروں گی۔"

پروین اختر کے نوٹس لے گئی۔ لیکن مہینہ بھر کی بیماری سے بہت کمزور ہو گئی تھی تھوڑی دیر بھی پڑھتی تو چکر آجاتے۔ امتحان برابر قریب آرہے تھے۔ اس نے کچھ پڑھا ہی نہ تھا اور نہ پڑھا جاتا تھا۔ کالج سے بھی چھٹی لے لی تھی۔ دن بھر کمرے میں پڑی رہتی اور پڑھنے کی کوشش کیا کرتی۔ اسے عجیب پریشانی اور مایوسی تھی جب امتحان کے دو دن رہ گئے تو وہ کالج میں اختر سے ملنے گئی۔ اس کا گھنٹہ خالی تھا۔ اختر ٹہل رہا تھا۔ پروین دوسری طرف سے ہوتی ہوئی اس کے پاس آئی۔
اختر بولا "کہئے کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ کئی دن سے نظر نہیں آئیں آپ۔"
"طبیعت تو پہلے سے کچھ اچھی ہے لیکن پڑھا بالکل نہیں گیا۔ جتنا پڑھا وہ خاک سمجھ میں نہیں آیا۔"
"پھر"۔ اختر نے پوچھا۔
"اگر پچھلے کورس میں سے کچھ سوال دیدیئے تو شاید میں کچھ کر سکوں ورنہ ادھر کا کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔"
"پھر کیا ہوگا۔"

"ارے نہیں" اختر نے جلدی سے کہا "فیل ہونے کی کیا بات ہے"۔ اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

"کیا سوچنے لگے آپ"

دیکھئے ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔

اختر نے ترکیب بتائی تو وہ بولی "یہ تو بڑی خطرناک بات ہے"۔

اختر:۔ نہیں کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے آپ اطمینان رکھئے۔

کانج ہال میں سب کی سیٹیں امتحان کے لئے لگ گئی تھیں پرسوں سے امتحان شروع تھا۔ رات کو جب ہوسٹل میں سب سو گئے اور چاروں طرف سناٹا ہو گیا تو اختر اپنے کمرے میں سے نکلا۔ اس نے چوکیدار کو پہلے ہی ملا لیا تھا ہال کی چھت پر گیا۔ ہال پرانی وضع کا بنا ہوا تھا۔ بیچ میں ایک کافی بڑی چمنی تھی اس نے چمنی میں رسی باندھی اور نیچے لٹکا دی۔ آہستہ آہستہ رسی کے ذریعہ اترا۔ سب سیٹیں دیکھیں۔ اس کی سیٹ ایک کونہ میں تھی پروین کی دور تھی۔ اس نے پروین کی سیٹ اٹھا کر اپنے پاس لگائی اور اس کی جگہ دوسری سیٹ لگا دی۔ یہ کام کرنے کے بعد آہستہ آہستہ وہ اسی راستہ سے واپس ہوا۔ ہال کے بیچ میں پہنچا تھا کہ رسی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ بہت بلندی سے پتھر کے فرش پر گر پڑا۔ آواز سن کر چوکیدار جو باہر منتظر کھڑا تھا اندر آیا۔ سہارا دیکر اٹھایا۔ بائیں بازو میں شدید تکلیف اور درد تھا۔ اور ہلتا جلتا بھی نہ تھا۔

"ارے بابو جی" چوکیدار گھبرا کر بولا "یہ ہاتھ تو معلوم پڑتا ہے کہ ٹوٹ گیا۔

وارڈن صاحب کو بلاؤں"۔

"ارے ایسا غضب نہ کرنا" وہ جلدی سے بولا "میں ہوسٹل چلا جاؤں گا تم اپنا کام ٹھیک کر لو"۔

(۳)

رات بھر وہ ہسپتال میں رہا۔ ہاتھ جوڑ کر اس پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا تھا۔ صبح کو باوجود ڈاکٹروں کے منع کرنے کے وہ ہوسٹل واپس چلا آیا۔ اور سب سے کہدیا کہ رات سینما گیا تھا وہاں سیڑھیوں پر سے گر گیا۔

امتحان کے دن صبح پروین سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا "ارے یہ کیا...... میں نے آپ سے جب ہی منع کیا تھا۔ زیادہ چوٹ تو نہیں لگی"۔ اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"جی نہیں کچھ ایسی زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ اختر نے مسکرا کر جواب دیا "صرف فریکچر ہو گیا تھا اس پر پلاسٹر لگا دیا ہے"۔

"فریکچر ۔ ارے......" پروین جیسے اچھل پڑی مختلف جذبات کی شدت کی وجہ سے چند لمحہ تک کچھ نہ بول سکی۔ اس کے بعد بولی "دیکھئے آخر آپ نہ مانے اور ذرا سی بات کے پیچھے اتنی تکلیف اٹھائی اب کچھ زیادہ درد تو نہیں ہے"۔

"تکلیف تو ہے مگر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے"۔

"اتنے میں امتحان کا گھنٹہ بج گیا اور دونوں ہال میں جا کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ دونوں کی نشستیں ایک الگ کونہ میں تھیں جہاں نگران کم آتا تھا۔

اختر نے پروین کو تمام پرچہ کروا دیا۔ ہر امتحان میں اسی طرح اختر اس کو جواب لکھوا دیتا۔

وہ روز شام کو ہسپتال جاتا جس دن امتحان ختم ہوا اسی دن پلاسٹر کٹنا تھا۔ ڈاکٹر نے پلاسٹر الگ کر کے ہاتھ کا معائنہ کیا اور بولا "مسٹر اختر ہم نے تم کو بہت منع کیا کہ تم امتحان نہ دو روز کے آنے جانے میں ہاتھ خراب ہو جائے گا۔ مگر تم نہ مانے۔ ہاتھ کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اب تمہیں علاج کرانا ہے تو داخل ہونا پڑے گا۔"

اختر ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ پروین روز اسے دیکھنے آتی اور دیر تک باتیں کرتی رہتی۔ ایک دن اختر نے کہا "ڈاکٹر کہتا ہے کہ کل آپریشن ہو گا ہاتھ کا اس لئے آپ کل نہ آیئے گا۔"

"آپریشن ہو گا" وہ دل میں سہم گئی مگر اس کو تسلّی دینے کیلئے بولی "تو خیر کچھ ایسی بات نہیں ہے میں اور جلدی آجاؤں گی تاکہ آپکے پاس اس وقت رہ سکوں"۔
"آپ کی اس عنایت کا شکریہ" اختر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپکے اس وقت آنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ روز روز آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔ لوگوں کو ممکن ہے کچھ خیال گذرے۔"

"خیال گذرے" پروین بولی "مجھے لوگوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔ لوگوں سے زیادہ مجھے آپ عزیز ہیں کیا میں آپ کی خاطر......"

اتنے میں نرس ٹمپریچر لینے آگئی وہ دونوں خاموش ہو گئے۔
"کیوں مسٹر اب ہاتھ کیسا ہے"۔ پروین نے پوچھا۔

"ہاتھ اچھا نہیں ہے کل آپریشن ہوگا۔ مسٹر اختر نے خود اپنا ہاتھ خراب کر لیا ہے۔" نرس نے چارٹ پر ٹمپریچر لکھتے ہوئے جواب دیا۔

اگلے دن آپریشن ہوا۔ پروین برابر آپریشن روم کے باہر بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ آپریشن کے بعد اختر کو اس کے کمرے میں لٹا دیا۔ پروین نے نرس سے پوچھا آپریشن کیسا ہوا ہے سسٹر!"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" نرس نے جواب دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ سب ڈاکٹر اور نرسیں جا چکی تھیں۔ اختر ابھی تک بے ہوش تھا۔ پروین اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی ہوئی اس کی روشن پیشانی اور نازک خط و خال کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ بیماری اور تکلیف کی وجہ سے سرخ و سپید رنگ زردی مائل ہو گیا تھا۔ آج وہ اس کو زیادہ حسین معلوم ہو رہا تھا۔

"کتنا بڑا ایثار کیا ہے اختر نے" پروین نے سوچا۔ "کام خواہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو لیکن محض اس کی خاطر اس نے اتنی تکلیفیں برداشت کیں اور خدا جانے کب تک اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔ خدا کرے جلدی سے اچھا ہو جائے ...... پھر ...... پھر" وہ خیالات کی رو میں بہت دور بہہ گئی۔ اس کو کالج لان کی ایک چاندنی رات یاد آگئی۔ جب مہ کامل کے جلوے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اور اختر بیٹھے ہوئے فلسفہ کے کسی مسئلہ پہ بحث کر رہے تھے گفتگو کا رخ بدلا اور فلسفہ محبت پر گفتگو ہونے لگی۔

"محبت ہے حماقت۔" اختر بولا "مگر دلچسپ اور ایسی حماقت جس کے بغیر

کوئی آدمی عقلمند نہیں کہا جا سکتا۔"

"محبت انسان کو کامل بنا دیتی ہے۔ شیکسپیئر کا قول ہے۔" اپلا نے جواب دیا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" اختر بولا۔

اسی طرح گفتگو کے پہلو بدلتے رہے۔

چاندنی کے حسین جلوے، فضا کی خنکی رات کی رانی کی مست کُن خوشبو ماحول کا سحر انگیز اثر کچھ ایسا تھا کہ وہ باوجود کوشش کے اپنے جذبات نہ روک سکی اور جب دونوں واپس ہوئے تو پیمانِ وفا اور شادی کے مقدس بندھن کے عہد دونوں کے لبوں نے مہرِ محبت ثبت کر کے مستحکم کر دیئے تھے۔ وہ انہیں خیالات میں تھی کہ نرس داخل ہوئی اسکی آہٹ سے پروین چونک گئی اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

(۴)

دوسرے دن پروین آئی تو اختر کا چہرہ کچھ وحشت زدہ سا تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا کچھ تکلیف زیادہ بڑھ گئی ہے؟"

اختر نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ اتنے میں نرس آئی۔ پروین نے اس سے پوچھا تو وہ بولی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ بالکل خراب کر لیا ہے۔ ان سے شروع ہی میں کہا تھا کہ ہوسٹل نہ جاؤ مگر یہ نہ مانے نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ بالکل خراب ہو گیا ہے۔"

"ہیں ـــ" پروین کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ہاتھ خراب ہو گیا! پھر"

"ڈاکٹر نے ان سے کہا ہے کہ ہاتھ کاٹنا پڑے گا......"

پروین یہ سن کر دھک سے رہ گئی۔ اسکے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی چند لمحہ تک وہ نرس کو اس انداز سے دیکھتی رہی جیسے وہ سب غلط کہہ رہی ہے نرس نے اس کو غور سے دیکھا اور ٹمپریچر لیکر چلی گئی۔

"پروین ــ!" اختر نے مدھم آواز میں کہا۔ پروین نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور نظریں جھک گئیں۔ دلوں کا حال نگاہوں نے کہدیا۔

ڈاکٹر نے کئی مرتبہ اختر سے ہاتھ قطع کرنے کیلئے کہا مگر اس نے ہر مرتبہ صاف انکار کردیا۔ کہ میں مرنا زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن اس طرح زندہ رہنا گوارا نہیں اختر اسی بات پر غور کر رہا تھا۔ اس کو خیال آیا کہ کیا ہاتھ قطع ہونے کے بعد پروین اپنے پیمانِ وفا پر قائم رہے گی۔ یا اگر وہ رہے بھی تو کم سے کم اس کو اتنا خودغرض نہ ہونا چاہیے۔ لیکن جس کی خاطر یہ سب کچھ ہوا ہے اس سے جدائی..... اس کے لئے ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پروین محض فرض شناسی کی بنا پر اپنے پیمان پر قائم رہے لیکن ممکن ہے کہ اس کے دل میں وہ جگہ نہ رہے جو اس وقت ہے..... وہ حالت...... اف...... اس کی نظروں میں آئندہ کا نقشہ پھر گیا۔ "نہیں نہیں۔ میں ہرگز ہاتھ الگ نہ کرواؤنگا۔ مجھے مرنا پسند ہے کم سے کم اس حالت میں پروین کے دل میں تو کوئی جگہ باقی رہے گی لیکن دوسری صورت میں......" وہ انہیں خیالات میں تھا کہ پروین داخل ہوئی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس سے ہوکر آرہی تھی ڈاکٹر

نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ اختر اس طرح انکار کر رہا ہے یہ اس کیلئے بہت خطرناک ہے۔ ہو سکتا ہے کہ زہر سارے بدن میں پھیل جائے۔ اس لئے وہ خود اختر کو سمجھا دے اور اس کو ہاتھ قطع کرنے کیلئے تیار کر دے۔

اختر نے آہٹ سنکر دیکھا۔ پروین کا چہرہ اُترا ہوا اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں

"اختر.....!" پروین نے اختر کو پکارا مگر دل بھر آیا اور بے اختیار آنسو بہ نکلے۔

اختر کا دل بیماری اور ان خیالات کی وجہ سے بہت نازک ہو گیا تھا۔ پروین کو اس حالت میں دیکھ کر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔

جب دونوں کے دل سے غم کے بادل کچھ چھٹ گئے تو وہ بولی۔ "تو تم نے پھر کیا کہا اختر"!

"میں نے" اختر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "میں نے ڈاکٹر سے صاف منع کر دیا۔"

"آخر کیوں"؟

"میں اُس حالت سے مرنا بہتر سمجھتا ہوں۔"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو" پروین نے اس کا منہ اپنے ہاتھوں سے بند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ تم اس......"

"مگر کیا تم مجھے اس حالت میں دیکھنا پسند کرو گی۔" اس نے پروین کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بات کی تہ تک پہنچ گئی۔

"تم کیا باتیں کر رہے ہو اختر" پروین نے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے الفاظ سے پھرنے والی نہیں۔"

اختر کی آنکھیں چمک اُٹھیں مگر پھر کسی خیال سے ماند پڑ گئیں وہ بولا۔" مگر پروین مجھے اس حالت میں رہنا گوارا نہیں"!

"اپنی خاطر نہیں میری خاطر" ارملا نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"اچھا صرف تمہاری خاطر" اختر نے مدہم آواز میں کہا اور اس کے چہرہ پر نظریں جمادیں"!

(۵)

اختر کا ہاتھ قطع بھی ہو گیا اور زخم بھی اچھا ہو گیا۔ لیکن وہ خود اپنی اس حالت پر رنجیدہ تھا۔ اب تنہائی پسند بھی ہو گیا تھا۔ بہت کم اور لڑکوں سے ملتا۔ کالج میں بھی سب کی نظروں سے الگ رہنے کی کوشش کرتا۔ اس کے دوست اس کی بہت دلجوئی کرتے اور ہر طرح اس کی طبیعت کو بہلاتے لیکن اس حادثہ کے بعد اس کو اپنے اندر بہت تغیر محسوس ہونے لگا۔ کبھی گھنٹوں بڑے آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا کچھ سوچا کرتا۔ پروین سے بھی وہ ذرا کم ملتا تھا حالانکہ وہ اسکی شکایت بھی کرتی۔ اس کو یہ خیال ہو چلا تھا کہ پروین کے دل میں اس کی وہ محبت نہیں رہی۔ حالانکہ اس کی طرف سے کوئی اس قسم کی بات نہیں ہوئی تھی پھر بھی اس کو یہ شبہ ہو گیا تھا۔ اور بڑی حد تک اس کا خیال دُرست بھی تھا۔ پروین نے جب پہلی مرتبہ اختر کو اس طرح کالج میں دیکھا۔ تو اس کو ایک دھکا سا لگا۔ ہسپتال میں اختر سے پیمانِ وفا کی تجدید کرتے وقت اس کے ذہن میں یہ صورت نہ تھی۔ لیکن جب حقیقت سامنے تھی تو تخیل کی عمارتیں بیٹھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ وہ اب بھی اختر سے اسی طرح ملتی بلکہ پہلے سے زیادہ دلجوئی کرتی لیکن

لاشعوری طور پر اس میں دوسرے جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ اس سے بالکل بے خبر تھی اور اپنے طور پر ہر طرح اس کی طبیعت بہلانے کی کوشش کرتی کچھ عرصہ تک فرض شناسی اور ایثار کے خیال نے ان جذبات کو دبائے رکھا لیکن تحت الشعور میں مدھم خطوط اب اجاگر ہو رہے تھے۔ وہ اب بھی اس سے بے خبر تھی۔ لیکن اختر اس کی ہر بات میں اپنے تجسس کی بنا پر کوئی نہ کوئی پہلو اسی قسم کا نکال ہی لیتا تھا۔ ہسپتال میں پروین نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا۔ کہ "صرف میری خاطر" لیکن ذہن میں اس کے یہ نقشہ نہ تھا اور وہ واقعی اختر کو اس حالت میں دیکھنے کو تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی محبت آہستہ آہستہ نفرت میں تبدیل ہوتی گئی۔

ادھر ایک تو اختر کو اپنی حالت کا صدمہ تھا۔ دوسرے وہ اس کے رویہ کو بھی سمجھ رہا تھا۔ مستقبل کی سنہری اُمیدیں صرف دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی تھیں۔ ان سب باتوں سے وہ بہت دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ گھنٹوں اپنے کمرے میں پڑا ہوا کسی تصویر یا نشان کو بے معنی تکا کرتا۔ پروین سے اب بھی ملتا تھا دونوں ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھتے لیکن اپنے آپ کو یا ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے۔

اختر کو پروین کے اس رویہ کا بہت زیادہ صدمہ تھا لیکن جب وہ اپنی حالت کو دیکھتا تو خیال کرتا کہ اس کا یہ رویہ فطری ہے۔ لیکن اس کا یہ حال کس کی خاطر ہوا ہے۔ پھر ہسپتال میں پروین کے کہے ہوئے الفاظ اس کے کانوں میں گونج اُٹھتے۔ کبھی خود اپنے آپکو ملامت کرتا کہ پروین نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ پھر وہ خود بخود اس طرف سے کیوں بدگمان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض اس کا خیال ہو۔

اس خیال سے اسکی آنکھیں چمک اُٹھتیں اور دل ڈوبتے ڈوبتے تیرنے لگتا۔

پروین کے دل میں اس کیلئے اب وہ پہلی سی جگہ نہیں رہی تھی۔ وہ سوچتی کہ یہ وعدہ کیونکر نبھایا جائے گا۔ کیا وہ اس طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر سکتی ہے۔ مگر اختر کی اس حالت کی ذمہ دار بھی تو وہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض شناسی اور ایثار کا جذبہ قوی ہو جاتا اور اس کی مٹھیاں عزم و استقلال سے بندھ جاتیں۔ مگر پھر اختر کی شکل سامنے آجاتی اور وہ خواہ مخواہ کانپ اُٹھتی۔ لیکن کیا اس طرح اختر کا دل نہ ٹوٹ جائیگا۔ کیا اس کی زندگی تباہ ہونے میں کچھ کسر باقی رہ جائے گی جس کی تنہا ذمہ دار صرف وہی ہے۔ لیکن —— اگر وہ خود اس کی جگہ پر ہوتی —— تو —— تو کیا اختر اُس حالت میں بھی اس کو قبول کر لیتا —— شاید —— مگر نہیں —— مرد سب بے وفا ہوتے ہیں —— اور عورتیں —— وہ خود ——!

(۶)

اختر چھٹیوں میں گھر چلا گیا۔ پروین بھی اپنے گھر گئی تھی۔ جب تک ہوسٹل میں تھی اختر سامنے تھا۔ تو وہ جذبہ کچھ ماند تھا۔ لیکن اب وہ جذبہ اور قوی ہو گیا۔ اختر کا کبھی خیال بھی نہ آتا۔ اور اگر آبھی جاتا تو وہ گھبرا کر اس طرح ٹال دیتی جیسے ایک دنیا دار موت کے خیال کو۔ پھر کچھ ماحول بھی ایسا ہی مل گیا۔ اس کا چچازاد بھائی اس کا ہم عمر تھا۔ برسوں کے بعد دونوں ملے تھے۔ یہ خلا جو اسکی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اسکی موجودگی سے بھر چلا۔

اُدھر اختر کی امیدوں کا واحد مرکز پروین کا خیال تھا۔ اس کی صحت بہت گر گئی تھی۔ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ہر وقت بخار بھی رہتا تھا۔ ایک دن جب طبیعت بہت

زیادہ خراب تھی تو اس نے پروین کو خط لکھا۔ کئی دن سے وہ سوچ رہا تھا لیکن پھر نہ معلوم کیا خیال کر کے رک جاتا۔ پروین تو گویا اس کو بالکل بھول چکی تھی۔

(۶)

اختر بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ پروین کو خط بھیجے ہوئے مہینہ بھر سے زیادہ گذر گیا تھا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس سے اس کو سخت صدمہ ہوا۔ آج کچھ اسکی طبیعت سنبھلی ہوئی تھی۔ وہ زینہ میں سیڑھیوں پر لکڑی کے سہارے کھڑا ہوا کھڑکی میں سے سامنے لہراتے ہوئے کھیت دیکھ رہا تھا۔ آج نہ معلوم کیوں اسے پروین رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ خیالات ماضی کے دھندلکے میں بھٹک رہے تھے۔ تخیل نے ایک منظر سامنے کر دیا۔ اس کو وہ رات یاد آ گئی جب وہ دونوں تاروں کی جھلملاتی ہوئی مدھم روشنی میں دریا کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ پروین اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے۔ کس قدر حسین معلوم ہو رہی تھی وہ۔ اختر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اتنے میں ڈاکیہ نے اس کو خط لا کر دیا۔ اس نے پتہ پڑھا۔ طرز تحریر دیکھ کر دل غیر معمولی طور پر دھڑکنے لگا۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا۔ پروین کا خط تھا۔ بہت مختصر۔ اور ساتھ ہی اسکی شادی کا دعوت نامہ بھی ملفوف تھا۔ اختر کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں دماغ پر اندھیرا سا چھانے لگا۔ تو وہ اپنے جسم کو نہ سنبھال سکا قدم لڑکھڑائے اور سیڑھیوں پر سے لڑھکتا ہوا نیچے گر پڑا ـــــــــ!

وُہ عورت......

"کرنل ـ اس کے متعلق تم نے سُنا" ارشد نے سگار کی راکھ سُنہری طشتری میں جھاڑتے ہوئے پُوچھا۔

عجیب طرح کا انسان تھا ارشد ـــــ اگر اس کا نام ارشد ہی تھا کیونکہ مجھے تو اس کے نام کے متعلق بھی شبہ تھا "جہاں گشت" تو اسے کہا ہی نہیں جاسکتا۔ مجھے تو آوارہ گردبھی کہنے میں تامّل ہے۔ شاید آپ میرا مطلب سمجھے نہیں۔ اگر وہ آپ کو آج آگرہ میں ملا ہے تو کل اس سے ملاقات لاہور میں ہوگی۔ اور آپ کو وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا۔ کہ دوسری مرتبہ اس سے کب اور کہاں ملیں گے۔ اکثر مہینے اور سال گزرجاتے اور وہ کہیں نظر نہ آتا۔ پھر یکایک کسی رنگین خیال شاعر کے نوزائیدہ شعر کی طرح آموجود ہوتا۔ سنجیدگی اور متانت تو اس کی شوخ اور چلبلی طبیعت سے ایسی بھاگتی تھی جیسے محبوب کے تخیل سے عاشق کا تصور ـــــ وہ قانون کا پابند نہ تھا بلکہ میرے خیال میں قانون کو اپنا پابند سمجھتا تھا۔ کچھ روایتیں بھی اس کے ذرائع آمدنی کے متعلق مشہور تھیں۔ لیکن اس کے محبوب اور مخصوص احباب ان "افواہوں" پر غور کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہے دُنیا والوں کے لئے کچھ بھی ہو لیکن اپنے حلقۂ احباب میں بہت محبوب تھا۔ ہر شخص کو یہی یقین تھا کہ ارشد دوسروں کی بہ نسبت اس سے بہت زیادہ قریب ہے۔

بہر حال کچھ بھی ہو جب وہ گفتگو کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے شیرینی اور نغمات کے دھارے الفاظ کے سنگ ریزوں سے کھیلتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور وقت بالکل غیر محسوس طریقہ پر گذر جاتا۔

چنانچہ میں نے جلدی سے سر ہلا کر کہا۔ "کرنل واس! ہاں ہاں کہو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میری مراد" ارشد نے سگار پر چٹکی مارتے ہوئے کہا۔ "اس تصویر اور پژمردہ گلاب کے پھول سے ہے جو کرنل کے انتقال کے بعد اُن کے ڈبہ میں ملا۔"

"ہاں ہاں تم کہے جاؤ۔" میں نے پھر کہا۔ "میں ذاتی طور پر کرنل کو نہیں جانتا مگر افواہیں ضرور سُنی ہیں۔"

ارشد ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچنے لگا اور پھر بولا۔ "کرنل کے انتقال کے بعد اور چیزوں کے ساتھ ان کا آبنوسی ڈبہ جس پر مشرقی وضع کا باریک کام بنا ہوا تھا، کھولا گیا تو اس میں ایک تصویر —— حسین دوشیزہ کی۔ اور ایک پژمردہ گلاب کا پھول آسمانی رنگ کے ربن سے بندھا ہوا تھا۔ مسز واس نے بتایا کہ مرحوم اس آبنوسی ڈبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن اس تصویر کو وہ بھی نہ پہچان سکیں۔ اس کے علاوہ کرنل کے مخصوص احباب بھی کچھ نہ بتا سکے۔ ہاں صرف میں اس معمہ کی عقدہ کشائی کر سکتا تھا"

"صرف تم"! میں نے اپنا سنہری سگار کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں صرف میں۔" ارشد نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ "اُس دوشیزہ کا نام ارملا تھا۔ آج سے بیس ۲۰ برس پہلے کرنل اس سے مغربی وضع کے ایک ہال روم میں ملا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں کرنل کا دل ارملا کی "جعد مشکیں" میں ایسا پھنسا کہ واپس نہ آسکا۔

— مگر میں کرنل کو الزام نہیں دے سکتا۔ وہ اس معاملہ میں بے اختیار تھا — تم نے شاید وہ تصویر دیکھی نہیں۔ وہ مشرقی شاعروں کی حسین تخیلی محبوبہ سے بھی زیادہ دل رُبا بلکہ ہوش رُبا تھی۔ کرنل ایسا از خود رفتہ ہوا کہ وہ اس سے چند لمحوں کے لیئے بھی الگ نہ ہو سکا۔ ارملا کرنل کی اس بیخودی سے بہت زیادہ متعجب ہوئی کیونکہ اس کے لیئے پہلا اتفاق تھا — لیکن کرنل کی "دوستی" کی بنیاد پر ایک دلکش اور نظر فریب محل قائم کیا جا سکتا تھا۔ کرنل کافی متمول شخص تھا"۔

ارشد نے سگار کی راکھ طشتری میں جھاڑی اور سنہری انگشتری گھماتے ہوئے کہنے لگا۔ "اس رات ارملا کرنل کی خوبصورت کار میں اپنے گھر گئی۔ کرنل نے اس سے دوسرے روز پھر ملنے کی التجا کی۔ ارملا نے شام کو بیکر گارڈن میں ملنے کا وعدہ کر لیا۔ اس شام کرنل راجہ آرجی کے ہاں عصرانہ پر مدعو تھا۔ وہ کسی طرح ارملا کو بھی وہاں مدعو کرانے پر کامیاب ہو گیا — ایک نوخیز دوشیزہ کے لیئے واقعی یہ اعزاز تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کرنل کے ساتھ آزادانہ منظرِ عام پر آئی۔ عصرانہ کے بعد دونوں نے مشترکہ رقص کیا۔ کرنل واقعی خوش قسمت تھا کہ وہ ارملا سے بغل گیر ہوا — لیکن ارملا اس قسم کی لڑکی نہ تھی۔ وہ پھر بھی مشرقی ماحول کی پیداوار تھی"۔

"تین چار دن کے بعد ایک سنہری اور رومان انگیز شام کو کرنل نے ارملا کو نذرِ محبت پیش کی — خوبصورت اور بیش قیمت جواہرات کا ہار — یہ جواہرات کرنل کے خاندانی تھے اور ان کے الگ کرنے پر اس کو مسز داس کیساتھ ناخوشگوار طرزِ عمل بھی روا رکھنا پڑا۔ لیکن ارملا کی مدھ بھری آنکھوں نے ایسا تیرِ بے کماں پھینکا تھا۔ جو اس کے ہدفِ دل کے پار ہو چکا تھا۔ ع

بچیرم کہ عجب تیر بے کماں زدہٴ

اس کو نذرِ محبت پیش کرنے کیلئے خانگی فضا کی خنکی اور ناخوشگواری بھی منظور تھی جواہرات الگ کر دینے سے داس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی عزیز شے گم ہو گئی۔ لیکن عزیز ترین چیز کے پا لینے کی اُمید میں اسے عزیز تو کیا عزیز ترشے سے بھی علیحدگی منظور تھی۔

ایک رات کرنل داس نے اپنی دلی خواہش ارملا سے کہہ ڈالی۔ ارملا یہ سُن کر سہم گئی۔ اس کیلئے یہ پہلا اتفاق تھا۔ لیکن میں کہہ چکا ہوں۔ کہ وہ اس قسم کی لڑکی نہ تھی۔ اس نے کرنل کو صاف الفاظ میں جواب دے دیا اور ساتھ ہی ساتھ اُسے جواہرات کا ہار بھی واپس کر دیا۔ ہاں اس نے ایک "الوداعی بوسہ" کی اجازت دیدی۔ اور پھر فوراً کرنل کے پاس سے چلی گئی۔ بے چارہ کرنل مستقبل کے سنہری ایام کا انتظار کرتا رہا کہ شاید یہ پتھر کی دیوی پھر پسیج جائے۔ لیکن وہ ایام پھر کبھی نہ آئے۔

مرحوم کرنل نے اس سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن اس ملکۂ ناز کے بارگاہِ حسن میں کبھی شرفِ باریابی حاصل نہ ہو سکا۔ اس رات کے بعد پھر ارملا کہیں نظر نہ آئی۔ کرنل نے بھی بہت تلاش کیا شہر شہر ڈھونڈا۔

اس کے پاس اب جو کچھ رہ گیا تھا وہ گلاب کا پھول آسمانی رنگ کے ربن سے بندھا ہوا جسے ارملا بالوں میں لگائے ہوئے تھی۔ اور اس کی ایک تصویر تھی جسے کرنل نے بصد منت حاصل کیا تھا۔

یہ دنیائے رنگ و بو بھی عجیب ہے۔ بیس سال تک وہ ایک خیالِ موہوم میں

رہا۔ ایک پھول اور ایک تصویر کی پرستش کرتا رہا۔ لیکن یہ راز کسی کو بھی نہ معلوم ہو سکا۔ یہاں تک کہ موت کے بیرحم ہاتھوں نے اس کو ان محبوب ترین چیزوں سے الگ کر دیا۔ اور جب آبنوسی ڈبہ میں پژمردہ گلاب کا پھول اور یہ تصویر نکلی تب لوگوں کو یہ راز معلوم ہوا۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آجتک کوئی کرنل واس کے خاندانی جواہرات کی حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ اور مرحوم کرنل کو بھی پتہ نہ چلا۔"

"تمہارا مطلب کہ. . . . . ." میں نے کہا۔

"ہاں" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم صحیح سمجھے۔ ارملا نے جو جواہرات کرنل کو واپس کیئے۔ دراصل وہ نہیں تھے جو کرنل نے ارملا کو دیئے تھے۔"

"کرنل پہچان نہ سکا—" میں نے تعجب سے کہا۔

"اگر کرنل پہچان لیتا تو!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں مسٹر ولیش جوہری کا مصنوعی جواہرات بنانے کا کمال ہی کیا تھا۔"

"خداوندا!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"دنیا میں رہنے کے لئے ہر قسم کے کام کرنے پڑتے ہیں۔" ارشد نے پانوں کی سنہری ڈبیہ نکالتے ہوئے کہا۔

"لیکن۔" میں نے ڈبیہ میں سے پان لیتے ہوئے پوچھا۔ "میں نہیں سمجھ سکا کہ اس طرح ارملا کو کیا فائدہ ہوا۔ اسے جواہرات کا ایک ہار مل گیا۔ لیکن اگر وہ کرنل واس جیسے مالدار شخص کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر تیار ہو جاتی تو اُسے ایک کیا سینکڑوں ہار مل جاتے۔ اس فریب کی کیا ضرورت تھی۔"

"بالکل غیر ممکن تھا۔" ارشد نے تمباکو کی چٹکی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ قطعی

ناممکن تھا۔"

"اس نے شادی کی ہے؟"

"نہیں نہیں کبھی نہیں۔ اس کی حیاتِ شیریں میں کوئی شریک نہ ہو سکا۔"

"پھر کیا ہؤا ارشد! تم نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔ پوری بات تو بتاؤ۔ ارملا جواہرات لینے کیلئے اِسقدر مستعد کیوں تھی۔ اگر شادی سے اِسقدر گھبراتی تھی۔ کیا تم اس کے متعلق اور کچھ جانتے ہو؟"

ارشد پان کا مزہ لیتا رہا اور کچھ نہ بولا۔ لیکن برابر میری طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب طرح کا تبسّم رقص کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر پان کھایا اور مدھم لہجہ میں کہنے لگا۔

"تم جانتے ہو میں جوانی میں خوبصورت ہی نہ تھا بلکہ ایک اچھا ایکٹر بھی تھا اور کالج کے ڈراموں میں مَیں نے ہمیشہ بہترین پارٹ ادا کیا ہے۔"

"لیکن میری بات کا جواب دو" میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ "ایک قصّہ تو ختم کر لو۔ اب ارملا کہاں ہے؟"

"میں کہہ تو رہا ہوں"۔ ارشد نے کہا۔ "ارملا یہاں ہے۔ تم سے گفتگو میں مشغول ہے۔ نہیں سمجھے —— میں ہی ارملا تھا۔"

فرض و محبّت

شام کا وقت تھا۔ گھنے جنگل میں پوری طرح رات پھیل چکی تھی۔ ناشپاتیوں کے درخت کی دورویہ قطاروں میں پتلی سڑک امیدِ موہوم کی طرح جھلک رہی تھی۔ ایک سُرخ رنگ کی موٹر اندھیرے میں اپنی آنکھیں چمکاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ جب موٹر ایک بڑے ناشپاتی کے درخت کے قریب سے گذری تو درخت کے اُوپر سے کسی نے ریوالور چلایا۔ گولی سنسناتی ہوئی اپنے نشانہ پر لگی۔ موٹر رُکی۔ اور ڈرائیور نے پیچھے دیکھا۔ محکمہ جنگلات کا افسرِ اعلیٰ اوندھے مُنہ گرا ہوا تھا۔ گولی دماغ کے پار ہو چُکی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ درخت کے پتّوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کوئی آدمی گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

(۲)

فرانس کی رعایا اپنی حکومت کے خلاف تھی۔ باغیوں کی خفیہ کارروائیاں سرگرمی سے جاری تھیں۔ قومی انجمن کے ممبر حکومت کے مختلف شعبوں میں پھیل چکے تھے۔ اور اسی طرح کوئی نہ کوئی حکومت کا افسر باغیوں کا نشانہ بنتا تھا لیکن حکومت باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے باغیوں کا کوئی سُراغ نہ لگا سکی۔

جم بھی ایک ایسی ہی قومی انجمن کا ممبر بن چُکا تھا۔ وہ ریلوے کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ملازم تھا۔ گاڑیوں کی آمدورفت کے وقت لائن پر پٹریاں بدلنا اس کا

کام تھا۔ اس کی شادی کو دو سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن جب سے وہ اس قومی انجمن کا ممبر بنا تھا۔ اس نے اپنی بیوی صوفیہ اور یکسالہ بچے جیکب کو اپنی ماں کے پاس دوسرے گاؤں میں بھیجدیا۔

آج قومی انجمن کو اطلاع ملی تھی کہ رات کو دو بجے والی گاڑی سے حکومت کے چند افسر اعلےٰ آرہے ہیں۔ یہ وہی افسر تھے۔ جن کی اس قومی انجمن کو مدت سے فکر تھی۔ اور ان کا زندہ رہنا ملک و قوم کے حق میں سم قاتل سمجھتی تھی۔ ان کے قتل کا قرعہ فال جم کے نام پڑا۔ اس کو حکم ملا۔ کہ جس وقت یہ گاڑی آئے وہ غلط پٹریاں بدل کر پوری ٹرین کو الٹ دے۔ اس میں کچھ بیگناہ ضرور مارے جائیں گے۔ لیکن آزادی کی دیوی بغیر بھینٹ لئے ہوئے مہربان نہیں ہوتی۔ اس میں خود اس کی جان کا بھی خطرہ تھا۔ لیکن ملک و قوم کی خاطر وہ ہر وقت اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھا۔

(۳)

۱۲ بج چکے تھے۔ ماحول پر ایک بے کیف خنکی سی چھائی ہوئی تھی ہوا کے تیز جھونکے ناشپاتی کے درخت کے جھنڈوں میں دیوانہ وار گھسے جا رہے تھے۔ لمبی لمبی مضبوط شاخیں ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر خوفناک چیخیں نکال رہی تھیں۔ جم کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے اسٹیشن تھا۔ دوسری لائن پر ایک پوری مال گاڑی سامان سے لدی ہوئی کھڑی تھی جم نے سوچا کہ کیوں نہ لائن بدل کر میل کو اس مال سے لڑا دیا جائے۔ پوری گاڑی الٹ جائیگی۔ ایک مسافر بھی نہ بچے گا۔ اور اگر پچھلے ڈبوں کے کچھ مسافر بچ بھی گئے۔ تو وہ افسر یقینی ہلاک ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کا سیلون

انجن کے پاس ہو گا۔ انجن اور اس کے ساتھ کے چند ڈبوں کا تو پتہ بھی نہ چلے گا۔ لیکن اس میں خود اس کی جان کا بھی تو خطرہ تھا۔ غلط لائن بدل دینا کس قدر خطرناک جرم تھا — !وہ اس کے انجام کا خیال کر کے چونک پڑا — اونہہ! یہ بزدلی ہے۔ اول تو ہو سکتا ہے کہ اس میں اس کی جان بچ جائے۔ اور صرف ملازمت سے علیحدگی یا چند سال کی قید پر ہی سزا ختم ہو جائے۔ کیونکہ اس کی گزشتہ خدمات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پر کسی قسم کی بدنیتی یا باغیانہ کارروائی کا شک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ابھی پچھلی مرتبہ اس کے افسر نے اس کے کام اور محنت سے خوش ہو کر اس کی ترقی کی سفارش کی تھی۔ اس لئے اس کی جان تو یقیناً بچ جائیگی۔ رہی صوفیہ اور ننھا جیکب۔ وہ گاؤں میں خوش رہیں گے۔ لیکن جب صوفیہ کو اس حادثہ کی خبر پہنچے گی کہ جم نے گاڑی اُلٹ دی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ تو اس کے دل پر کیا بیتے گی — اس خیال سے اس کو دل پر ایک بوجھ سا معلوم ہونے لگا۔ — "میں نے پہلے ہی صوفیہ کو اس واقعہ کی خبر دے دی ہوتی تو اچھا تھا" لیکن ممکن ہے کہ اس صورت میں حکومت اس کے ارادے سے باخبر ہو جاتی۔ اور اقدامِ قتل کا الزام عاید ہو جاتا۔ جس کا نتیجہ یقیناً سزائے موت ہوتا۔ خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا" — اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج چکا تھا۔ گاڑی کے آنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔

"ایک گھنٹہ — صرف ساٹھ منٹ — ایک حادثۂ عظیم میں باقی ہیں۔" اس نے دل میں دہرایا۔

سرد ہوا کے شوخ جھونکے کیبن کے دریچہ سے آ کر اس کے بالوں سے کھیل

رہے تھے۔ اسے کچھ سردی سی محسوس ہونے لگی۔ گلے سے مفلر کھول کر اس نے اپنے سر اور بالوں پر لپیٹ لیا۔ زینہ پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ اس کا دوست ٹاڈ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

"جم"! ٹاڈ نے اپنے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا "مٹھائی کھلاؤ تو ایک بات بتاؤں"۔

"کیا بات ہے"۔ جم نے کہا۔ "مجھے اس وقت زیادہ ..... پریشان نہ کرو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ کیا بات ہے بتاؤ تو سہی۔ مٹھائی بھی کھا لینا"۔

"مسز جم اور ننھا جیکب دو بجے والے میل سے آ رہے ہیں"۔ ٹاڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کہو دوست کیسی خبر سنائی"؟

جم کو یوں محسوس ہوا جیسے شیشے کا کوئی نازک گر قیمتی برتن ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہو گیا۔ ٹاڈ جو اس بات کا متوقع تھا کہ جم اچھل پڑے گا۔ چہرہ خوشی کے مارے کھلے ہوئے کنول کی طرح دمکنے لگیگا جم کے اس خلاف امید سکوت پر متحیر سا رہ گیا۔

جم کے کانوں میں ٹاڈ کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اُتر گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے معلوم ہوا ٹاڈ"۔

"یہ دیکھو" ٹاڈ نے جس کی تمام شگفتگی ختم ہو چکی تھی اپنی جیب سے تار نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تار۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تمہارے نام آیا تھا"۔

جم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار لیا اور پڑھا "صوفیہ اور جیکب دو بجے والے میل سے آ رہے ہیں"۔ تار کے الفاظ جم کی آنکھوں کے سامنے ڈراؤنی شکل کے بھوت بن کر ناچنے لگے۔ مختلف جذبات کی شدت سے زرد چہرہ یک لخت سُرخ ہو گیا

ٹاڈ نے جو بڑی حیرت سے یہ تغیر دیکھ رہا تھا۔ پوچھا:۔
"کیوں جم خیریت تو ہے؟ اور تو کچھ تار میں نہیں لکھا؟"
"ہاں خیریت ہے۔ آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"
جم نے ٹاڈ کی آواز پر چونکتے ہوئے کہا "دیکھو ڈیڑھ بج گیا ہے۔ گاڑی آنے والی ہے۔ میں تو یہاں ڈیوٹی پر ہوں تم صوفیہ ـــــ اور ننھے جیکب کو اتار لینا" یہ کہتے ہوئے اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ایک دبی ہوئی سرد آہ نکل گئی۔ مگر خیریت ہوئی کہ ٹاڈ نہ سن سکا۔
"اچھا۔" ٹاڈ نے پژمردگی سے کہا اور ڈھیلے ڈھیلے قدم ڈالتا ہوا نیچے اتر گیا۔
جم کے دماغ کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف فرض ـــ ملک و قوم کا فرض ـــ دوسری طرف محبت ـــــ محبوب بیوی اور ننھے بچے کی محبت ـــــ! عجیب کشمکش تھی ـــــ اسے اپنی محبت کے ابتدائی لمحات یاد آگئے جنوری کی ایک سرد مگر حسین شام ـــــ جب اس نے صوفیہ کو پہلی مرتبہ اس کی ماں کے ساتھ پارک میں دیکھا تھا۔ اس نے آسمانی رنگ کی اونی شال اپنے سنہرے بالوں پر لپیٹ رکھی تھی۔ اور ہاتھ میں سفید گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ وہ کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی ـ نارنگی کے ایک کنج کے پاس دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ اس کے بعد ـ جب وہ گھر لوٹا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی اس کی بے کیف زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ جسے شاید صوفیہ ہی پر کر سکتی تھی۔ اس کے بعد ـــــ اس کے بعد دونوں کی شادی ایک طویل مگر رنگین و دلکش داستان ہے۔ اس کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب وہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑے

ہوئے گرجے سے باہر نکل رہا تھا۔ صوفیہ سفید سلک کے لباس میں آسمان کی نیلاہٹوں سے اُترتی ہوئی پری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے نازک گلابی لبوں پر حسین تبسّم رقص کر رہا تھا۔ جذبات کی شدّت سے اس کے سینہ کا دل آویز تموّج شباب و رعنائی کی چڑھتی ہوئی ندی کا رُخ بتا رہا تھا اس کے دوست شادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ اور پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔ اس کے بعد ایک سال کی حسین اور پُر کیف مُدت کتنی جلد گزر گئی ــــ دونوں کی آغوش میں ایک گل تر تھا ــــ جیکب ــــ ننھا جیکب۔ دونوں کی اُمیدوں کا ننھا مرکز ــــ جیکب کی روشن پیشانی اور سنہرے بال بالکل صوفیہ کی طرح تھے۔ اس کے ننھے ننھے کٹوروں کی طرح چھلکتی ہوئی آنکھیں جن میں شرارت اور ذہانت کا ایک حسین امتزاج تھا ــــ"

اتنے میں اسٹیشن پر گاڑی کی آمد کی گھنٹی بجی۔ جم کے خیالات کا محل ایک نازک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ گھنٹی کی آوازیں اس کے دل پر مسلسل ضربیں لگا رہی تھی۔ اب وہ اُٹھ کر اپنی اصلی جگہ پر آ گیا۔ اور پٹڑی بدلنے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ ہینڈل صحیح پٹڑی بدلتا ہے۔ لیکن نہیں۔ اس کو دوسرا ہینڈل چلانا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ دوسرے ہینڈل پر رکھ لیا۔ ایک ذرا سی جنبش سے تمام گاڑی اُلٹ جائے گی۔

لیکن نہیں۔ وہ اسے نہیں چلائے گا۔ اس کی پیاری صوفیہ اور ننھے جیکب کی جان بھی اب خطرہ میں تھی۔ دونوں کا ختم ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن ــــ وہ ملک اور قوم کی خاطر ہر قسم کی قربانی ادا کرنے کی مقدس قسم جو کھا چکا تھا۔ ہاں ــــ وہ اپنا فرض ادا کر کے رہے گا۔ مگر تخیل نے صوفیہ کی مرمریں باہیں اور معصوم چہرہ سامنے کر دیا۔ اور ساتھ ہی جیکب کی ننھی ننھی آنکھیں...... اس نے

ایک اضطراری کیفیت میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور پھر دل کو تقویت دینے کیلئے انگلی سے اپنے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔

انجن کی سیٹی کی آواز پر وہ یک لخت اچھل پڑا ــــــ فرض اور محبت ــــــ اس کے دل میں عجیب کشمکش تھی ــــــ نہیں اس سے یہ نہ ہو سکے گا۔ وہ اپنے جیکب کو نہیں کچل سکتا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہینڈل پر سے اٹھا لیا۔

انجن کی آواز برابر تیز اور نزدیک ہوتی جا رہی تھی اس کی روشنی بھوت کی آنکھ کی طرح چمک رہی تھی۔ سامنے چمکتی ہوئی پٹریاں لمبے لمبے سیاہ سانپوں کی مانند لہرا رہی تھیں...... میل کیبن کے پاس آ گیا ــــــ جم کو پٹری بدلنا ہے۔ وہ کونسا ہینڈل گھمائے!!؟ ایک طرف ملک و قوم کی بہبودی ــــــ دوسری طرف ننھے بچے اور معصوم بیوی کی محبت ــــــ!

اس کی نظروں کے سامنے ایک مرتبہ پھر صوفیہ کا حسین چہرہ اور ننھے جیکب کی مچلتی ہوئی آنکھیں آ گئیں۔ صوفیہ کے سنہرے بال ہوا میں لہرانے لگے۔ اور جیکب کے ننھے ہاتھ اس کی گود میں آنے کیلئے اٹھ گئے ــــــ مگر فرض نے محبت کو ٹھکرا دیا ــــــ جم نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں ــــــ دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوسرا ہینڈل گھما دیا ــــــ!

میل ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ مال سے لڑ گیا ــــــ اور جم نیم بے ہوشی کی حالت میں ہینڈل کے پاس گر پڑا ــــــ!

حقیقت و افسانہ

"غلط بالکل غلط" حمید نے کوچ پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہارا مطلب یہ ہے کہ بہرام وغیرہ کے متعلق جو محیر العقول افسانے مشہور ہیں وہ سب درست ہیں میں کبھی تسلیم کرنے کیواسطے تیار نہیں ہوں کہ ایسے حیرت انگیز واقعات درست ہو سکتے ہیں یہ صرف "زیب داستان" کیلئے بڑھا دیئے جاتے ہیں اور کچھ نہیں۔"

"پھر وہی بے تکی بات" وحید نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ حقیقت افسانہ سے کہیں زیادہ دلچسپ اور حیرتناک ہوتی ہے۔"

"بالکل بچوں کی سی بات" حمید نے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ دعویٰ بیدلیل" اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "اس پر زور تسلیم کروانے کا اصرار!"

وہ جانتا تھا کہ وحید ان آدمیوں میں سے ہے جو اپنی بحث کے ثبوت میں مستحکم دلائل اور اٹل ثبوت پیش کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس نے یہ فقرہ بطور طنز کے کہا تھا تیر نشانہ پر بیٹھا اور وحید تیزی سے بولا۔ "واقعات تمہیں خود تسلیم کرنے پر مجبور کر دیں گے کہ حقیقت افسانے سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔"

"اچھا" حمید نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے وحید کو چڑانے کو کہا "تم میری آستین کے بٹن نکال لو اور مجھے خبر نہ ہونے پائے!"

"یہ تو نہیں مگر ہاں تقریباً ایسا ہی کام اور تمہیں دکھاؤنگا۔" وحید نے فیصلہ کن

لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم رات کو سوتے وقت اپنی گھڑی مسہری کے قریب کی میز پر رکھ دیتے ہو۔"

حمید نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"میں کل رات کو تمہاری گھڑی غائب کر دونگا۔"

حمید نے ایک زور سے قہقہہ لگایا۔

"ہنسنے سے کام نہیں چلے گا۔" وحید نے کچھ جل کر کہا۔ "اگر میں کامیاب ہوا تو تمہیں پارٹی دینی ہوگی اور سینما بھی دکھانا ہوگا ورنہ میری طرف سے سینما اور پارٹی۔"

"منظور" حمید نے وحید کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "مگر تم نے اپنے ذمہ وہ کام لیا ہے جو شاید بہرام بھی کرنے کی جرأت نہ کرتا۔"

"تم ہر ممکن تدبیر کر لینا اور ساتھ ہی پلازا (سینما) میں سیٹ بھی محفوظ کرا لینا۔" وحید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ یہ تمہارا کام ہے۔"

"خیر دیکھا جائیگا۔" وحید ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اب کل ملاقات ہوگی۔"

(۳)

حمید دوسرے دن شام کو گاؤں سے گھر لوٹا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اپنے بنگلہ کے صدر دروازے پر آ کر اسے خیال آیا کہ دروازے کی کنجی غائب ہے۔ جیبیں ٹٹولیں مگر غائب۔ ساتھ ہی اسے وحید کی بات یاد آ گئی۔

"خیر" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "گھڑی غائب نہیں کر سکتا کنجی غائب کر لی

تو گیا ہے۔"

یہ کہکر وہ کھڑکی کے ذریعہ اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا اسی کشمکش میں اس کے چاقو کے دونوں پھل ٹوٹ گئے آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد آخر اس نے کھڑکی کھول لی اور اندر داخل ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر سگار کے کش لگانے لگا۔ سرمئی رنگ کا مچھے دار دھواں فضا میں اڑتا جا رہا تھا اور وہ وحید کی شرط کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گھڑی آسانی سے غائب نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسے وحید کی عادت بھی معلوم تھی کہ وہ جس کام کے کرنے کا بیڑا اٹھاتا اسے تکمیل ہی تک پہنچا کر دم لیتا۔

"اچھا پھر میں مدافعتی کارروائی شروع کر دوں"۔ یہ کہکر وہ اٹھا اور اوپر کی منزل میں اپنی خوابگاہ میں جا کر سب سے پہلے اس نے پشت پر کھلنے والی کھڑکی کو مضبوطی سے بند کیا اور پھر مضبوط پیتل کے تار کا جال سا اس کے گرد بنا دیا۔

"اب اسے کوئی نہیں کھول سکتا"۔ یہ کہکر وہ مسکرایا۔ "اچھا ایک کام اور کرنا چاہیے"۔ یہ کہکر اس نے ایک گھنٹی خوابگاہ کے دروازے پر اندر کی طرف لٹکا دی تاکہ کواڑ کے ذرا سے بھی کھلنے سے گھنٹی بج جائے۔ گھنٹی لٹکا کر اس نے آہستہ سے کواڑ کھولا۔ کواڑ کھلتے ہی گھنٹی ٹن سے بج اٹھی "بالکل ٹھیک" میں غافل سوتا ہوں مگر اتنا بھی بیہوش نہیں ہو جاتا کہ گھنٹی کے بجنے پر بھی نہ اٹھ سکوں"۔

پھر کچھ سوچ کر نیچے گیا۔ ہال کے بیچ میں ایک بڑا ٹب لا کر رکھا اسے پانی سے بھرا اور ایک مضبوط سی سُتلی لیکر دیواروں میں کیلیں گاڑ کر سارے کمرے میں

تارِ عنکبوت کی مانند جال بنا دیا۔ واقعی اس میں سے تو کوئی شیطان ہی نکل سکتا تھا۔ اس نے حتی الامکان مدافعتی کارروائی مکمل کر لی تھی مشین گنیں بالکل تیار تھیں دشمن جس وقت چاہے حملہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی ان تدابیر پہ ایک غائر نگاہ ڈالی اور اطمینان کا سانس لیا پھر وحید کو غائبانہ مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"دوست وحید! تم اس جال میں سے کسی ممکن تدبیر سے نکل بھی گئے تو۔" (مسکرا کر) "خوابگاہ کی گھنٹی کا کیا کرو گے!"

اب اسے بالکل اطمینان تھا اس نے چاروں گھونٹ بند کر دیئے تھے۔ خوابگاہ میں جا کر شب خوابی کے کپڑے بدلے بجلی گل کر کے میز پر رکھا ہوا لیمپ روشن کیا اور ایک دلچسپ ناول پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اسے جمائیاں آنے لگیں۔ گردن اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی گھڑی دیکھی۔

"اوہو ساڑھے گیارہ بج گئے! اب سونا چاہئے۔ صبح اٹھ کر میاں وحید سے پارٹی بھی تو کھانی ہے۔" یہ کہکر وہ خود بخود مسکرا دیا۔

لیمپ گل کر کے اس نے ہلکا نیلا بلب روشن کر دیا اور چادر تان لی۔ سونے سے پیشتر اس نے اپنے تمام مورچوں پہ ایک جرنیل کی طرح نظر ڈالی اور اطمینان سے لیٹ گیا۔

(۴)

زیریں منزل میں کسی چیز کے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی ہلکے نیلے بلب کی روشنی ٹھنڈی چاندنی کی طرح تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے برقی قمقمہ روشن کیا۔ اور میز پہ گھڑی دیکھنے کو جھکا۔

"ارے" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

گھڑی غائب تھی اور اس کی جگہ صدر دروازے کی کنجی رکھی ہوئی تھی حمید نے گھبرا کر دریچے کی طرف دیکھا۔ بجلی کی روشنی میں پیتل کا تار دریچے کے چاروں طرف کسا ہوا چمک رہا تھا۔ دروازے پر گھنٹی بدستور لٹک رہی تھی۔

نیچے اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

کوئی اب زینہ پر چڑھ رہا تھا۔

"وحید! وحید!!" حمید نے انتہائی تعجب سے پکارا۔

"خادم حاضر ہے" وحید نے دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"شیطان کے بھائی" حمید نے حیرت سے کہا۔ "ذرا اندر آ کر مجھے اپنی صورت تو دکھاؤ۔"

وحید باہر سے چٹخنی کھول کر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کیوں حقیقت زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے یا افسانہ" اس نے مسروقہ گھڑی مع سنہری چین کے حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں تسلیم کرنے پر مجبور ہوں" حمید نے اور زیادہ متعجب ہو کر کہا۔ "مگر بہرام کے چچا! یہ تو بتاؤ کہ تم آئے کدھر سے کہیں شیطان کی روح تو تم میں حلول نہیں کر گئی ہے۔"

"میں بڑی آسانی سے آ گیا تم دیکھ ہی رہے ہو" وحید نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "ہاں البتہ مجھے تمہارے کپڑوں کی اس کھونٹی کے پیچھے مکمل پانچ گھنٹے گزارنے پڑے ہیں۔ میں برابر تمہاری تمام کارروائیاں ملاحظہ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ تم نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اس وقت البتہ مجھے انتہائی ہوشیاری سے اپنی سانس روکنی پڑی۔ اس کے بعد تم ناول پڑھتے رہے پھر سو گئے۔ میں نے

آہستہ سے کھٹکا کیا مگر تم غافل پڑے سو رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے گھڑی اٹھائی اور چابی رکھ کر باہر چلا گیا۔"

"اور گھنٹی!" حمید نے استعجاباً پوچھا۔

ہاں اسے میں نے ایک ہاتھ سے پکڑ لیا تھا اس لئے وہ غریب بھی تمہاری مدد نہ کر سکی۔ پھر میں نیچے گیا وہاں سخت اندھیرا تھا۔ جس کی وجہ سے میں تمہارے لگائے ہوئے جال میں پھنس کر گر پڑا اور کھٹکے سے تمہاری آنکھ کھل گئی۔ ورنہ صبح کو یہ خادم حاضر ہوتا۔

"بڑے استاد نکلے تم" حمید نے جو یہ داستان بڑی حیرت سے سن رہا تھا ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو صبح کو پارٹی اور شام کو پلازا۔"

"ہاں ہاں ضرور" حمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سنگِ لرزاں

جزیرۂ آرہ میں کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا۔ جس نے سنگِ لرزاں کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ہر آدمی اس دن کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا جب وہ سنگِ لرزاں کے بھید کو معلوم کر کے "فایا" کے جواہرات کو حاصل

کرلیگا۔ پھر وہ ہوگا اور دُنیا بھر کے عیش — فاؔیا کے جواہرات کیا تھے۔ اس کے متعلق یہ قصہ مشہور تھا۔

کہ ایک روز جزیرۂ آرہ میں ایک اجنبی جس کا نام بؔل، تھا وارد ہُوا۔ اس کی ملاقات فاؔیا سے ہُوئی۔ بؔل مردانہ حُسن کا مکمل نمُونہ تھا۔ اس کے بھرے بھرے بازُو، چوڑا سینہ، کشادہ پیشانی، سیاہ گھونگھر والے بال فاؔیا کو بہت پسند آئے فاؔیا نے طے کر لیا کہ وہ بؔل کے ساتھ رہیگی۔

"راہی! تم میرے ساتھ رہنا پسند کروگے" فاؔیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فاؔیا، حسُن کے لحاظ سے قدرت کا بہترین شاہکار کہی جا سکتی تھی۔ اس کی مدھ بھری آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے جھیل کے ساکن پانی میں چودھویں رات کا چاند جگمگا رہا ہو۔ اس کی آواز میں ایک لوچ تھا، ایک لچک تھی۔ موسیقی گویا کوٹ کوٹ کر بھردی گئی تھی۔ جب ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے کوئی چھوٹا سا پہاڑی چشمہ گنگناتا چلا آرہا ہے۔ نووارد راہی بؔل ایک ہی نظر میں اسے دل دے بیٹھا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور فاؔیا کو اپنی شریکِ حیات بنائے گا۔

(۲)

فاؔیا اور بؔل ایک دُوسرے کے عاشقِ زار تھے۔ خصوصاً فاؔیا تو بؔل کی پرستش کرتی تھی۔ حالانکہ بؔل اس قابل نہ تھا مگر وہ اس کو فرشتہ ہی سمجھتی تھی۔

فاؔیا کو عجوبۂ روزگار اور نوادر اشیا کا خاص شوق تھا۔ اس کے پاس شارک مچھلی کے دانتوں کا ایک خُوبصورت ہار تھا اور دوسری بہت سی نادر اشیا تھیں۔ مگر سب سے بیش قیمت اس کے جواہرات تھے۔ سینکڑوں بڑے چھوٹے چمکدار پتھر ایک

تھیلی میں بند رہتے تھے۔ ان کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی اور تھے بھی وہ بہت نادر اور قیمتی۔

ایک دن فایا نے بل کو اپنی تمام چیزیں دکھائیں۔ بل اس کا ذخیرہ دیکھ کر اس کی خوش مذاقی پر بہت خوش ہوا، اور وہ تھیلی کے چمکدار، خوبصورت، چھوٹے بڑے پتھر دیکھ کر تو لوٹ ہی ہو گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ "اگر ایک پتھر کا بھی ایک ہوا تو بھی بیس ہزار پونڈ!! کتنی گراں قدر رقم ہے بیس ہزار پونڈ!" اس نے اپنے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ اور پتھر پھر تھیلی میں بند کر کے فایا کو دیتے ہوئے بولا۔

"تم نے بڑی اچھی اچھی چیزیں جمع کر رکھی ہیں فایا!"

وہ جواب میں مسکرا دی۔

رات کو جب تمام جزیرہ آرہ پر موت کا سا سکوت اور قبر کی سی تاریکی چھائی ہوئی تھی وہ آہستہ سے فایا کے پہلو سے اُٹھا۔ فایا بے خبر سو رہی تھی۔ ماہتاب کے اس پاس سیاہ بدلیاں چھائی ہوئی تھیں ــــ وہ دبے پاؤں خوابگاہ سے باہر آیا اور جواہرات کی تھیلی اُٹھا کر ساحل کی طرف چل دیا۔

بادبانی کشتی تیر کی طرح سمندر کے سینہ پر چلی جا رہی تھی۔ بل آیندہ زندگی کے خوش آیند خیالات میں غرق تھا۔ اسی حالت میں اس نے تھیلی اُٹھائی اور اپنی گود میں اس کا منہ اُلٹ دیا۔ مگر بجائے جواہرات کے ناریل کے چھلکے اور کچھ پتھر کنکر گود میں گر پڑے۔

فایا نے جواہرات دکھاتے وقت بل کے بشرے سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسکی

نیت بخیر نہیں۔ اس کی آنکھوں کی چمک نے فابا کے خیال کی تصدیق کی۔ اور اس نے پیش قدمی کے طور پر جواہرات چھپا دیئے۔

بل کے خیالات کا محل درہم برہم ہو گیا۔ انتہائی غصہ سے اس کا سینہ اُبھر گیا۔ سانس رُکنے لگی۔ اور اس نے غضب ناک ہو کر کشتی کا رُخ پھیرا چھوٹا ہؤا تیر واپس آ رہا تھا۔

ساحل پر اُترتے ہی وہ گھر کی طرف لپکا۔ فابا ابھی تک حُسن خوابیدہ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سیاہ زُلفوں میں اس کا چہرہ بہت دلکش معلوم ہو رہا تھا۔

بل نے غضبناک ہو کر ایک لات زور سے مسہری پر رسید کی۔ فابا گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔

"تو نے جواہرات کیا کیئے"۔ بل نے غصہ میں گرجتے ہوئے پوچھا۔

فابا نے گھٹنوں کے بل جُھک کر بل کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ پیارے بل تم ان پتھروں کا خیال نہ کرو۔"

"تو نے کہاں رکھے وہ جواہرات؟" الفاظ کے ساتھ ہی ایک گھونسہ فابا کے اُوپر پڑا۔ اور وہ گر پڑی۔ اس نے روتے ہوئے کہا "پیارے بل تم ان کا خیال نہ کرو۔"

"آخر تو نے ان کا کیا کیا"۔ بل نے غصہ سے بیتاب ہو کر کہا۔

"فابا نے ان کو چُھپا دیا"۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔

"کہاں"

"سنگ لرزاں پر"

بل فابا کو روتا چھوڑ کر پہاڑی کی طرف چلا۔ راستہ میں گھنا جنگل پڑتا تھا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ پہاڑی پر پہنچ گیا۔ ابھی اندھیرا تھا۔ دو گھنٹے اُسے صبح کے انتظار میں

فایا کو گالیاں دیتے ہوئے گذارنے پڑے، سُورج کی اولین کرن کے ساتھ ہی اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ پہاڑی پر چاروں طرف، سنگ لرزاں کے آس پاس سب جگہ دیکھا مگر کہیں جواہرات نہ ملے۔ آخر وہ پھر بڑبڑاتا ہوا واپس لوٹا کہ فایا سے زبردستی جواہرات حاصل کرے۔ اس نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو پچاس گز کے فاصلہ پر فایا کھڑی ہوئی اس کی تمام کارگزاریاں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے گالیاں دیتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ مگر وہ جنگل میں چھپ گئی۔ ایک ہفتہ تک یہی آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ فایا روز منتظر رہتی کہ شاید بل اب بھی ان پتھروں کو فراموش کر دے اور پھر اس کے ساتھ پُرمُسرّت زندگی بسر کرنے لگے۔ آخر ایک دن بل نے غصہ سے پاگل ہو کر فایا کے گولی مار دی۔

اس واقعہ کے بعد وہ شب و روز سنگ لرزاں کا راز معلوم کرنے کی کوشش میں رہتا۔ مگر جواہرات نہ ملنا تھے نہ ملے۔ آخر وہ اسی حالت میں پاگل ہو گیا اور ایک روز چوٹی سے گر کر مر گیا۔

اس واقعہ کو سات سال گذر گئے۔ جزیرہ آرہ اور اس کے قرب و جوار کے جزائر میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو گا جس نے سنگ لرزاں کا راز معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ مگر جواہرات کسی کو بھی نہ ملے۔ عوام کو اس بات کا یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی قسمت کا دھنی ان کو حاصل کرے گا۔

(۳)

ٹاڈا رورا نامی جہاز کا کپتان تھا۔ وہ بھی اپنی قسمت آزمائی کر چکا تھا اور ناکام رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کوشش میں حد سے زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اور

دُوسرے لوگوں کو جواہرات تلاش کرنیکی ترغیب دیتا تھا۔ کچھ اِس وجہ سے نہیں کہ وُہ بنی نوع انسان کا ہمدرد تھا۔ بلکہ اس لیئے کہ اس کی ترغیب پر اگر کوئی شخص جواہرات کو تلاش کرنے جائے اور تائید غیبی سے اگر جواہرات اسے مِل جائیں تو وہ اس کو قتل کر کے جواہرات پر قبضہ کرے۔ قتل کرنے کی اس نے ایسی عجیب ترکیب سوچی تھی۔ جو اس کے خیال میں اپنی نوعیّت کی پہلی اور آخری تھی۔ اس تدبیر کو سوچے سالہا سال گذر گئے تھے۔ مگر تقدیر نے عملی جامہ پہنانے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔

ایک دن اس کا جہاز اردراتاروں کے جزیرہ پر لنگر انداز ہوُا۔ اسے یہاں سے ناریل اور دُوسری خام پیداوار لے جانی تھی۔ جہاز سے اُتر کر ٹاڈ خلاصیوں کو مختلف کاموں کا حکم دیکر خوُد ناریل کے تاجر مسٹر جم سے مِلنے چلا گیا۔ اتفاق سے جم بھی ساحل کے قریب ہی مل گیا۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے مِلے۔ رسمی سلام ودعا کے بعد جم نے ٹاڈ سے کہا۔

"کیپٹن، میں نے دس ٹن ناریل تمہارے لِئے تیار کر رکھا ہے"۔

جم، ناریل کا تاجر تھا۔ تھوڑے عرصہ سے وہ اپنی نوشادی شدہ بیوی میری کے ساتھ سڈنی سے بسلسلہ تجارت ناروُن آگیا تھا۔

"گُڈ! اچھا مسنر جم کیسی ہیں؟"

"ویسے تو وہ بخیریت ہیں" جم نے کندھے ہلاتے ہُوئے کہا۔ مگر انہیں ناروُن کچھ پسند نہیں آیا۔ اصل میں سڈنی جیسے بڑے اور بارونق شہر کے مقابلہ میں کسی کو بھی ناروُن جیسا مقام جو بیرونی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو پسند نہیں آسکتا"۔

"ہاں درست ہے"! ٹاڈ نے لاپروائی سے کہا۔ اس نے مسز جم کو ابھی دیکھا تک نہ

تھا اس لیئے گفتگو کا یہ موضوع اسے کچھ پسند نہ تھا۔

"لیکن ہم زیادہ عرصہ تک یہاں نہیں رہیں گے۔" جم نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر مستعدی اور سخت محنت سے دولت پیدا کی جاسکتی ہے تو ہم انشاءاللہ بہت جلد مالدار ہو جائیں گے۔"

گفتگو کرتے ہوئے دونوں جم کے بنگلہ تک آپہنچے۔ بنگلہ خوبصورت تھا اور طرز جدید کی فن تعمیر کا بہترین نمونہ تقریباً بیس گز سامنے سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ برآمدہ میں مسز جم نغمہ بُن رہی تھیں۔

"میری! یہ کیپٹن ٹاڈ ہیں۔"

میری مسکراتی ہوئی اُٹھی اور ٹاڈ سے ہاتھ ملایا —— وہ نسوانی حسن کا ایک مجسمہ تھی۔ صناع قدرت کا بہترین شاہکار۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں شراب محبت کے دو ساغر لبریز تھے۔ وہ ایک شمع تھی جس کے پاس آکر پروانہ واپس جا ہی نہ سکتا تھا۔

ٹاڈ ایک لمحہ کیلئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی مسز جم"۔

—— تینوں باتیں کرتے ہوئے برآمدے کے سائے میں آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چاروں طرف خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کی دھیمی دھیمی خوشبو ہوا میں مل کر فرحت پہنچا رہی تھی۔ سامنے لب ساحل، جہاز کے خلاصی ناریل کو جہاز پر لاد رہے تھے۔ اور اپنی اس محنت کو کم کرنے کیلئے دیہاتی زبان میں ایک گیت گا رہے تھے۔ اردوا کے بادبان ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سورج کی کرنیں سمندر کے نیلے پانی میں لہروں کے نقوش کو اُجاگر کر رہی تھیں۔ اردوا کے سامنے کے حصہ پر پیتل کے بنے

ہوئے مور کا سنہری عکس نیلے پانی میں بڑا دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ مگر ٹاڈ اس پرکیف منظر سے ذرا بھی متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ اور متاثر ہوتا بھی کیسے۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس ماحول میں ہے۔ اس کے پس و پیش کیا ہو رہا ہے۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو مکاری و عیاری کا بین ثبوت تھیں۔ جم اور میری کے چہروں پر تھیں۔ کبھی وہ میری کو دیکھتا اور دل میں جذبات کا ایک طوفان محسوس کرتا۔ "کاش میری میری ہوتی"۔ یہ جملہ بار بار اس کے دل سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا۔ اس کا ہر بن مو میری کی عبادت گاہ حسن پر محو پرستش تھا۔ جب اس کی نظر جم پر پڑتی تو رقابت کی آگ یکدم بھڑک اُٹھتی۔ دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ بغیر جم کو ختم کئے ہوئے میری سے کسی قسم کی توقع رکھنا حماقت محض تھی ٹاڈ نے سوچا کہ جم کے اس بھولے پن سے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا جائے۔

دوران گفتگو میں جم نے کہا "میں نے دوسرے ممالک میں ناریل بھیجنے کا ٹھیکہ لیا ہے کیپٹن! اب عنقریب ہم مالدار ہو جائیں گے۔ پھر ہم دوسرے ملکوں کی سیاحت کو جائیں گے۔" یہ کہکر وہ میری کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ میری بھی جواب میں مسکرا دی۔

"اس میں گو کچھ عرصہ تو لگیگا خیر۔ چھپر پھاڑ کر بھی تو نہیں مل جاتا ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیوں مل کیوں نہیں جاتا۔ خدا تو چھپر پھاڑ کر بھی دیتا ہے"۔ ٹاڈ نے ایک عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے؟" جم نے پوچھا۔

ٹاڈ نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع شاید پھر جم کو بہکانے کا نہ ملے۔ بولا "تم آرہ جاکر فایا کے جواہرات کیوں نہیں تلاش کرتے۔ شاید تقدیر تمہارا ساتھ دے۔"

"اچھا! تمہارا خیال ہے کہ واقعی وہاں جواہرات ہیں۔" جم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"خیال ہی نہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ضرور فایا کے جواہرات وہاں موجود ہیں۔" ٹاڈ نے مدلل لہجہ میں جواب دیا۔

"مگر تمہیں معلوم ہے کپتان! کہ ہزاروں آدمی پہاڑی کا ذرّہ ذرّہ چھان چکے ہیں۔ اور ناکام رہے ہیں۔ پھر میں کیسے یقین کرلوں کہ وہاں وہم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔" جم نے کہا۔

"یہ صحیح" ٹاڈ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "مگر میرے ذہن میں چند ماہ سے ایک ترکیب ہے۔ اور اس ترکیب کا ذہن میں نہ آنا ہی تمام لوگوں کی ناکامی کا سبب ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ کہ جو شخص بھی اس پہاڑی پر گیا وہ صرف تنہا ہی گیا کیونکہ لالچی آدمی جواہرات سے بھرے ہوئے تھیلے میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرسکتے۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ سب لوگ پہاڑی اور سنگِ لرزاں کے آس پاس جھک مار کر چلے آئے۔ مگر یہ کسی کو بھی خیال نہیں آیا کہ سنگِ لرزاں کے اوپر چڑھ کے دیکھیں کیونکہ جب تک ایک آدمی سنگِ لرزاں کو روکے نہ رکھے دوسرا اس پر چڑھ نہیں سکتا۔"

"تو پھر تمہارا خیال ہے کہ جواہرات سنگ لرزاں کے اوپر ہیں۔" جم نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"یقیناً! جب ہزاروں آدمی تمام پہاڑی کو چھان چکے اور تا ایں دم کسی کو کچھ نہیں ملا تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ سنگِ لرزاں کے اوپر ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فایا سنگ لرزاں پر کس طرح چڑھ سکی۔" ٹاڈ نے کہا۔ "جم تم جانتے ہو کہ اس علاقہ کی عورتیں بالکل بلی کی سی خاصیت رکھتی ہیں۔ کم سے کم جگہ میں اپنا کام نہایت پھرتی سے انجام دے سکتی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ فایا نہایت پھرتی و چالاکی سے سنگِ لرزاں پر نہ چڑھ سکے۔ اسی طرح اس علاقہ کے تمام مرد فنِ پیراکی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔"

"اس علاقہ کی کیا خصوصیت ہے۔ غوطہ زنی اور تیرنے میں میں ہمیشہ کالج میں اوّل آیا ہوں۔ اور بیشمار تمغے میں نے جیتے ہیں۔" "کیوں میری۔" جم نے مسکرا کر میری کی طرف دیکھا۔

"میری صرف مسکرا دی اور پوچھا۔

"مگر یہ سنگِ لرزاں اور فایا کے جواہرات ہیں کیا چیزیں؟"

ٹاڈ تو خدا سے چاہتا تھا کہ میری بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کرے تاکہ وہ دونوں کو بہکا کر جواہرات تلاش کرنے کی ترغیب دے اور پھر اپنی پرانی تدبیر— قتل کی پوری کرے۔ "پھر میری اس کی ہے۔" اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے تمام قصہ از اوّل تا آخر سنایا۔ اوّل تو قصہ بذاتِ خود دلچسپ اور عجیب تھا۔ اس پر مستزاد ٹاڈ کا مخصوص اندازِ بیان اور پھر وہ بھی خاص مقصد کے تحت میں۔

"تو ابھی تک کسی کو وہ جواہرات ملے نہیں۔" میری نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اوں ہوں"۔ ٹاڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور مِلنے بھی کیسے کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ سنگِ لرزاں کے اُوپر جواہرات بھی ہو سکتے ہیں!"

"واقعی ٹاڈ! تم نے عجیب ترکیب سوچی ہے" جم نے کہا۔ جس پر کیپٹن کی ملمع کاری کا اثر ہو چلا تھا۔

"کیوں جم پھر تم دونوں کیوں نہ اپنی قسمت آزمانے جاؤ" میری نے مسکرا کر کہا۔ اس کی آنکھیں جواہرات کی غائبانہ چمک سے چندھیانے لگیں۔

"ہاں اگر کیپٹن میری شرکت پر رضامند ہو جائیں" جم نے اپنی آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ٹاڈ نے دیکھا کہ طائر خود دام کے قریب آ گیا ہے۔ ذرا سی ہوشیاری کی ضرورت ہے پھر تو صید در دامِ صیاد ——

بولا "یہ تجویز تو کئی ماہ سے پیشِ نظر تھی مگر کوئی آدمی میرے معیار کے مطابق مجھے نہ ملا۔ اس لئے میں نے اس کو ظاہر ہی نہیں کیا۔ اور آج تمہیں اس معیارِ مقررہ کے مطابق دیکھ کر میں نے یہ تجویز پیش کر دی۔ میں بخوشی تمہاری شرکت کے لئے تیار ہوں۔"

"تو پھر کب چلو گے" میری نے بیقراری سے پوچھا۔ ٹاڈ یہ دیکھ کر کہ اس کا وار کاری پڑا۔ مسکرایا اور بولا۔

"آج شام تک جہاز لد جائیگا۔ اور شام ہی کو ہم لنگر کھولدیں گے۔"

(۴)

ٹاردن سے آرہ تک ایک ہفتہ کا سفر تھا۔ یہ سفر ٹاڈ نے اپنی خوش مذاقی اور

پُر لطف باتوں سے اور زیادہ دلچسپ بنا دیا۔ ٹاڈ چاہتا تھا کہ جم اور میری دونوں ان دلچسپیوں میں محو ہو جائیں۔ اِدھر جم اور خاص طور پہ میری روز بروز ٹاڈ کی خوبیوں کی معترف ہوتی جاتی تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ کیپٹن ٹاڈ واقعی بہترین آدمی ہے۔

ایک دن صبح کو ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوائیں سمندر میں چل رہی تھیں۔ گہرے نیلے پانی میں سمندری مچھلیاں جا بجا اپنا سر اُوپر نکالتیں اور پھر جلدی سے ایک ڈبکی لگاتیں۔ ٹاڈ عرشہ پر کھڑا ہوا سمندر کے آخری حِصّہ پر غور سے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جہاز تیزی سے جا رہا تھا۔ یکایک اس نے میری کو پکار کر کہا۔

"میری! میری! جلدی آؤ۔ وہ دیکھو پہاڑی — سنگِ لرزاں —"

میری ٹاڈ کی آواز سُنتے ہی عرشہ کی طرف لپکی۔ اور اشتیاقِ دید میں جلدی جلدی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ابھی دو تین ہی سیڑھیاں چڑھی تھی کہ پاؤں پھسلا اور گد سے نیچے۔ کسی کے گرنے اور میری کے چیخنے کی آواز سُن کر اُوپر سے ٹاڈ اور نیچے سے جم دوڑے ہوئے آئے۔ جم نے اُسے سہارا دیکر اُٹھایا اور جہاز کے کیبن میں لے گیا۔

"کہیں چوٹ تو نہیں لگی" جم نے پُوچھا۔

"اوہ" میری نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "میرا ٹخنہ بُری طرح مڑ گیا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا" جم نے کہا اور اس کا ٹخنہ ملنے لگا۔

"کیا ہوا کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی" ٹاڈ نے کیبن میں داخل ہوتے ہوئے پُوچھا۔

"نہیں صرف تختہ مُڑ گیا ہے۔" جم نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت بُرا ہُوا۔" ٹاڈ نے بظاہر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو میری ہمارے ساتھ پہاڑی پر نہ جاسکیں گی۔"

"ہاں مجھ سے تو ایک قدم بھی نہ چلا جائیگا۔" میری اُداس لہجہ میں بولی۔

"کچھ حرج نہیں۔" جم نے غم غلط کرتے ہوئے کہا۔ "تم جہاز کے عرشہ پر ہی لیٹی رہنا ہم جلد آجائیں گے۔"

"مگر یہ گر کیسے پڑیں؟" ٹاڈ بولا۔ "جہاز کی تو ابھی صفائی ہوئی ہے۔ شاید کوئی سیڑھی چکنی ہوگی!"

"ہاں کوئی ایسی ہی چیز ہوگی۔" جم نے بے پروائی سے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد جہاز اروڑا ساحل آرہ پہ لنگر انداز ہوا۔ میری کو جم اور ٹاڈ سہارا دیکر عرشہ پر لائے اور وہیں لٹا دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد دونوں منزلِ مقصود کی طرف چلدیئے۔ ساحل سے پہاڑی تک دو گھنٹہ کا راستہ تھا۔ دونوں خاموشی سے اپنے اپنے خیالات میں محو چلے جارہے تھے۔

جم سوچ رہا تھا۔ "اگر جواہرات واقعی مل گئے تو ۔۔۔ ہم بہت امیر ہو جائیں گے۔ میں ناریل کی تجارت چھوڑ دونگا ۔۔۔ مگر نہیں ۔۔۔ چھوڑ دونگا نہیں ۔۔۔ بلکہ اعلیٰ پیمانہ پر شروع کردونگا ۔۔۔ پھر میں اور میری دونوں دوسرے ممالک کی سیاحت کو جائیں گے ۔۔۔ ہم ہوں گے اور عیش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ٹاڈ سوچ رہا تھا۔ "اب نکل کر کہاں جاسکتا ہے۔ صید مکمل طور پر دام کے اندر ہے میری کو شبہ بھی نہ ہوگا۔ جیسے اس نے جہاز کی سیڑھیوں پر ڈسیلین مل دی

تھی۔ اور میری نے پاؤں پھسلنے کو ایک اتفاقی حادثہ سمجھ لیا تھا۔ حالانکہ یہ بھی کیپٹن ٹاڈ کی اسی تجویز کی ایک کڑی تھی۔" یہ سوچ کر وہ خود بخود مسکرا دیا۔" چند دن میں میری جم کو بھول جائیگی۔ پھر وہ ہوگی اور کیپٹن ٹاڈ ــــــ اس خیال سے اس کا سینہ پھول گیا اور سانس رُکتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔

اب دونوں پہاڑی سنگِ لرزاں کے قریب آ گئے تھے۔

"یہ ہے وہ سنگِ لرزاں"۔ ٹاڈ نے اُوپر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ایک چوٹی پر نو فیٹ کا ٹھوس پتھر رکھا ہوا تھا۔" یہ ذرا زور پڑنے پر ہلنے لگتا ہے۔ اگر اس کو ایک آدمی پکڑ لے اور دُوسرا اس پر چڑھ جائے تو پھر یہ نہ ہلے گا۔" اچھا اب ہم میں سے ایک کو اس پر چڑھنا ہے۔

اس کا فیصلہ پیسہ اُچھال کر کر لیں"۔ یہ کہتے ہوئے ٹاڈ نے جیب سے پیسہ نکالا اور اُوپر اُچھال کر لپک لیا۔

"چت یا پٹ"!

"چت" جم بولا۔

"پٹ" ٹاڈ نے مٹھی کھولکر سکہ دکھاتے ہوئے کہا۔" اب تم اوپر چڑھو میں پتھر کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہوں"۔

"اچھا" جم نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور مستعدی سے پتھر پر چڑھنے کیلئے موزوں جگہ تلاش کرنے لگا۔ آخر ایک طرف سے اس نے چڑھنا شروع کیا۔ ٹاڈ نے پتھر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اب یہ سیمنٹ کی طرح مضبوط ہو گیا۔ ذرا بھی نہیں ہل سکتا۔ تم بے خوف ہو کر

چڑھ جاؤ ـــ" ٹاڈ نے شہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے"۔ جم نے پتھر کو ہلا کر دیکھا اور مضبوطی سے جما ہُوا پا کر کہا۔ اور اس پر چڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ ـــ سنبھل سنبھل کر جیسے پہاڑی بلّی چڑھتی ہے ـــ ایسے پتھر پر تو چڑھنا واقعی کاٹ دار دتھا۔ مگر اس طرف کے لوگ آب و ہوا کے اثر سے اور کچھ جغرافیائی ماحول کے سبب اونچی سے اونچی پہاڑیوں اور ڈھلوان سے ڈھلوان چٹانوں پر بے تکان چڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح بہُت بلندی پر سے گہرے گہرے سمندروں میں بڑی مشتاقی سے چھلانگ لگا جاتے ہیں۔ جیسے بندر معمولی فاصلہ کو ایک ہی جست میں طے کر لیتا ہے"۔

ٹاڈ پتھر پر اپنا زور لگائے مضبُوطی سے پکڑے ہُوئے جم کے چڑھنے کی آواز سُن رہا تھا۔ اب چڑھنے کی آواز رُک گئی۔ جم اُوپر پہنچ گیا۔

"کچھ ملا"۔ ٹاڈ نے نیچے سے چلّا کر پُوچھا۔

"کچھ بھی نہیں"

"پھر ـــ چٹان کیسی ہے ـــ کچھ دراز وغیرہ!"

"بالکل مسطح اور چکنی ـــ شاید باد و باراں کے اثر سے"!

"اچھا"۔ ٹاڈ نے اطمینان کا سانس لیکر کہا۔ "تم ذرا کھڑے ہو کر چاروں طرف ایک نظر ڈال لو۔ میں پتھر مضبُوطی سے پکڑے ہُوئے ہوں"۔

"کچھ بھی نہیں ہے"۔ جم نے ڈرتے ڈرتے کھڑے ہوتے ہُوئے کہا۔ "تین طرف ڈھلوان چٹان۔ سامنے گھنا جنگل ایک طرف گہرا سمندر اور دیوار کی مانند سیدھی چٹان"۔ جم نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر سمندر کی طرف دیکھ کر اس کا دل

کانپ اُٹھا۔

"کچھ نہیں ہے" ٹاڈ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "تو کچھ حرج نہیں تم ابھی سب کچھ دیکھ لوگے"۔ اتنا کہکر ٹاڈ نے اپنا تمام زور پتھر کے ایک سرے پر لگا دیا اور ہلکے ہلکے اوپر کی طرف اُٹھایا۔

ٹاڈ کے الفاظ جم کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اُتر گئے اسکی آنکھیں کھُل گئیں۔ بادل ہٹ چکا تھا اور مطلع صاف نظر آرہا تھا۔ ٹاڈ کی اصلی صُورت وسیرت جم کے سامنے آگئی۔ اس کا مقصد میری کو حاصل کرنا تھا۔ جواہرات تو ایک سنہرا جال تھا۔ جس میں میری اور ٹاڈ دونوں پھنس چکے تھے۔ مگر اب یہ احساس بعد از وقت اور یہ پچھتانا کھیت چگنے کے بعد تھا۔ پتھر ہلکی ہلکی جنبش کے ساتھ اوپر کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ ٹاڈ اپنی آرزؤں کو پُورا کرنے کے جوش میں قُرب منزل کے احساس سے اپنا انتہائی زور پتھر کے لُڑھکانے میں لگا رہا تھا۔

تدبیر مصروفِ عمل تھی اور تقدیر ہنس رہی تھی کس پر!!!

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ پتھر عنقریب لڑھکنے ہی والا تھا۔ اور تھوڑی دیر میں جم مع سنگ لرزاں کے دوسو فیٹ نیچے سمندر میں ــــ پھر ــــ بجلی کی سی سرعت سے جم کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ وہ نیچے ــــ دوسو فیٹ ــــ نیچے سمندر میں غوطہ لگائے۔ وہ بہترین پیراک اور لاجواب غوطہ خور تھا۔ مرنا یوں بھی ہے اور یوں بھی ــــ کیوں نہ آخری تدبیر کی جائے۔ چنانچہ وہ ایک زقند بھر کر نیچے سمندر میں کود پڑا۔ سَن ــــ سَن۔ "غوطہ گہرا ــــ سر کے بل"۔ جیسے کسی ہوا کے جھونکے نے اس کے کان میں کہا۔ جم نے کمال مشاقی اور انتہائی چالاکی سے ہوا میں

ایک قلابازی کھائی اور سر کے بل سمندر میں غڑاپ سے غوطہ لگایا۔ وہ چھ سات فیٹ نیچے پانی میں چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد اس نے اپنا سر اوپر نکالا۔ گہرا سانس لیا۔ اور ناک کان میں سے پانی جھاڑا۔ اب کدھر جائے۔ اس سرکس کے سے تماشہ نے اُسے بیحد تھکا دیا تھا۔ گھنے جنگل بہت دُور سے نظر آرہے تھے

سامنے دیوار کی مانند چٹان کھڑی تھی۔ جو اسے جواں مردی و پامردی اور عزم و استقلال کا سبق دے رہی تھی۔ جنگل تک وہ ایک گھنٹہ میں پہنچ سکتا تھا۔ مگر اسے چند منٹ سانس لینے کی بھی ضرورت تھی۔ یکایک چٹان کے قریب ایک لٹھ نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وہ تیرتا ہوا — پانی میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا لٹھے تک گیا اور اس پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ لٹھے کے دُوسری طرف اُسے کچھ تھیلیاں سی نظر آئیں۔ اس نے اُٹھایا۔ ایک پُرانی تھیلی جس کا رنگ دھوپ اور بارش کے سبب اُڑ گیا تھا — وہ پایا — کچھ سخت سخت ٹکڑے۔ شائد سنگ ریزے۔ کھولکر دیکھا۔ جواہرات!! فاپا کے جواہرات!!! تقدیر ہنس رہی تھی۔ کس پر؟ اُسے لٹھے پہ بیٹھے ہوئے ایک منٹ بھی نہ گذرا تھا۔ مگر جواہرات پا کر اسکی ساری تھکن دُور ہو گئی۔ ایسا تازہ دم ہو گیا جیسے خوب نیند بھر کر سویا ہے۔ اس نے تھیلی کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھی۔ اور تیزی سے سمندر کے سینہ پر تیرنے لگا۔ اسے جا کر فدا ٹاڈ کو بھی تو مزا چکھانا تھا۔ وہ تو پانسہ پلٹ گیا ورنہ اس نے تو مارنے میں کوئی کمی چھوڑی نہ تھی — وہ ایسی سرعت سے تیر رہا تھا جیسے بجلی تار پہ دوڑتی ہے۔ اس کی رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ گویا تھیلی میں فاپا کے جواہرات نہیں تھے بلکہ بجلی کا خزانہ تھا۔ کچھ دیر بعد

وہ کنارے پر آگیا۔ چند لمحے اس نے آرام کیا پھر کنارے کنارے وہ اروڑا کی طرف چلا۔

(۵)

ادھر ٹاڈ کامیابی کے جوش اور کامرانی کے نشہ میں ہمہ تن زور بنا ہوا پتھر پر زور لگا رہا تھا۔ یکایک اُسے اوپر کی طرف ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا۔ اور تھوڑی دیر بعد پتھر بھی دوسری طرف لڑھک گیا۔ پتھر لڑھکتے ہی ٹاڈ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور مسرت کے جوش میں تالیاں بجانے لگا۔ "اب میری میری ہے یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا کہ پتھر لڑھک گیا۔ اور جم بھی فایا کے جواہرات کی طرح لاپتہ ہو گیا۔ اس کو غم تو ضرور ہو گا۔ مگر میں جلد ہی اس صدمہ کو بھلا دوں گا —— پھر —— پھر" ٹاڈ اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے سینہ میں جذبات کا ایک طوفان اُٹھا۔ اور سفینۂ دل ہچکولے لینے لگا۔

وہ جلدی جلدی جنگل طے کرتا ہوا ساحل کی طرف چلا جا رہا تھا ساحل پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جہاز اروڑا ساحل سے دور ہو چکا ہے۔ عرشہ پر میری جم کے گلے میں باہیں ڈالے کھڑی ہے۔ جم کے ایک ہاتھ میں کچھ چیز ہے —— شاید تھیلی —— جسے وہ ہلا ہلا کر دکھا رہا ہے۔ اس کو ایک مسرت بھرے لہجے میں ہلکی سی آواز سمندری ہواؤں کے سہارے آتی ہوئی سنائی دی۔

"ٹاڈ تم قسمت کے دھنی ہو۔ فایا کے جواہرات کی تھیلی چٹانی دیوار کے نیچے سمندر میں لٹھے پر تھی۔"

جم تھیلی ہلا رہا تھا۔ اور میری —— شاید مسکرا رہی تھی۔

اروڑا نیلے سمندر کا سینہ چیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اُفق میں

نظروں سے اُوجھل ہو گیا۔ مگر کیپٹن ٹاڈ ساحل پہ کھڑا ہُوا مشرق کی طرف سمندر میں نہ جانے کیا چیز دیکھ رہا تھا ـــــــ

قُلی

مرغوب پور ریلوے کا بڑا جنکشن تھا۔ پانچ پلیٹ فارم تھے۔ ہر وقت گاڑیاں آتی اور جاتی رہتی تھیں۔ اسٹیشن پہ ہمہ وقت ایک ہنگامہ، رونق، چہل پہل اور زندگی سی رہتی۔ ہزاروں مسافر روزانہ اترتے اور سوار ہوتے۔ اسی نسبت سے قلی بھی اسٹیشن پہ بہت کثرت سے تھے۔ جب گاڑی آتی تو بھوکے گدھوں کی طرح اسکی طرف لپکتے اور جلد سے جلد کسی موٹی آسامی کی تلاش میں رہتے۔ باوجود قلیوں کی کثرت کے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی مسافر مل ہی جاتا۔ پُل پر سے دوسری طرف لے جا کر تانگوں کے پاس پہنچا دیتے اور حسب منشا ۲ آنہ ۴ آنہ وصول کرتے۔ اگر کوئی مسافر تامل کرتا یا کچھ پیسے کم دیتا تو دُور تک پیچھا نہ چھوڑتے یہانتک کہ وہ تنگ آکر کچھ پیسے اور دیتا اور ان کے چنگل سے نجات پاتا۔ نو واردوں کو تو وہ اتنا تنگ کرتے کہ کچھ انتہا نہیں اپنی تمام لسانیت تجربے اور بلاغت کو ختم کر دیتے اور پانچ چھ آنہ وصول کئے بغیر نہ مانتے۔ انہیں اخوان الشیاطین کے درمیان ایک ولی بھی تھا ـــــ رحیم ـــــ اسم بامسمیٰ۔ تھا تو قلی مگر دل کا غنی تھا۔ کبھی

کسی سے جھگڑا نہ کرتا۔ جو مسافر نے دیدیا وہ لے لیا۔ کم پر تکرار نہ زیادہ پر اصرار ــــ فرصت کے وقت میں جب اور قلی گپ شپ کرتے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے کرتے گالی گلوچ پر اُتر آتے۔ وہ سب سے الگ رہتا اور پاس ہی کی مسجد میں جا کر نماز ادا کرتا۔ اگر کسی قلی کو چوٹ پھینٹ لگ جاتی تو مرہم پٹی کرتا۔ کوئی بیمار پڑجاتا تو تیمار داری کرتا۔ اس دن کا اسٹیشن کا ناغہ کردیتا مگر مریض کے پاس سے نہ ہٹتا۔ خدمت کرتا بے لوث اور بے غرض ــــ

پھر ایسے شخص سے قلی کیوں نہ محبت کرتے۔ اس کو اپنا بزرگ جانتے اس کا ادب کرتے۔ اس کے اشارۂ ابرو پر گردن کٹانے کو تیار ہو جاتے جہاں اس کا پسینہ گرتا وہاں خون گراتے۔

رحیم مرغوب پور کے قلیوں کی جماعت میں مثل سردار کے تھا ــ آپس کے جھگڑوں میں اس کا فیصلہ اٹل۔ دونوں فریق بسر و چشم تسلیم کر لیتے کیونکہ جانتے تھے کہ بے جا طرفداری اور حمایت رحیم کی فطرت بلند سے دور ہے۔

یہ سب کچھ تھا مگر یہ کوئی نہ جانتا تھا کہ رحیم کون ہے ــــ وہ اکیلا تھا اور اکیلا ہی رہتا تھا۔ کوئی نہ جانتا تھا کہ وہ قلی ہونے سے پہلے کیا تھا۔ اس کی فطری پھرتی اور چالاکی ــــ ذہن رسا اور متین و سنجیدہ چہرہ آنکھوں کی ایک خاص چمک اس بات پر دلالت کرتی تھی کہ وہ قلی ہونے سے پہلے خواہ کوئی بھی ہو لیکن غیر معمولی انسان تھا۔

(۲)

شیورودھا کی واردات معمولی بات نہ تھی۔ راجہ جگوپالی کا اس پر اصرار

طریقہ سے لب دریا قتل ہو جانا ایسا واقعہ تھا جس نے ایوانِ حکومت تک میں تھرتھری ڈال دی تھی۔ سرکار نے اس کی عقدہ کشائی کیلئے ملک کے مشہور جاسوس خان بیدار خان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ خانصاحب عرصۂ دراز تک سرکاری محکمۂ جاسوسی کے افسر اعلیٰ رہے۔ بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ مخفی سے مخفی راز کی پردہ دری میں انہیں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ بڑے بڑے ڈاکو جنہوں نے ملک بھر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ان کے سامنے ہیچ نکلے۔ واقعہ جتنا دہشتناک اور پُر اسرار ہوتا تھا ان کو اتنا ہی لطف آتا تھا۔ گورنمنٹ نے انکی خدمت کے اعتراف میں بڑے بڑے انعامات عطا کئے۔ اب وہ عرصہ سے پنشن لیکر اپنے آبائی وطن میں اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کام سے کنارہ کش ہو چکے تھے مگر مقدمہ کی پیچیدگی دیکھتے ہوئے سرکار کے پیہم اصرار کے بعد وہ صرف اس واقعہ کی جاسوسی کرنے کے واسطے ایک دفعہ پھر میدانِ عمل میں آ گئے تھے۔

(۴)

طوفان میل اپنی پوری رفتار سے زمین کا سینہ چیرتا ہوا چلا جا رہا ہے خان بیدار خان اپنے مخصوص درجہ میں ایک نشست پر لیٹے ہوئے ہیں۔ شنبور دھا سے وہ واقعات کی تحقیق کر کے واپس آ رہے ہیں۔ وہ دو راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں خمار ہے دماغ میں گذشتہ واقعات فلمی تصاویر کی طرح گردش کر رہے ہیں راجہ کا قتل۔ جائے وقوع۔ مظلوم رانی کا حسنِ سوگوار وغیرہ۔ وہ انہیں خیالات میں منہمک تھے کہ اُن پہ غنودگی

سی طاری ہوگئی ــــ گاڑی اپنی انتہائی رفتار سے جا رہی تھی۔ چوں کہ اسی سلسلہ میں خانصاحب کو دوسرا موقع دیکھنے جانا تھا اس لیے سرکاری ہدایت کے مطابق گارڈ سے کہہ دیا گیا تھا کہ بڑے سے بڑے اسٹیشن پر بھی گاڑی صرف چند منٹ ٹھہرائی جائے ــــ گاڑی اسٹیشن چھوڑتی ہوئی فراٹے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد خانصاحب نے انگڑائی لی اور آنکھیں کھول دیں سرہانے میز پر اپنی گھڑی کو دیکھنے اٹھے۔ مگر وہاں سے گھڑی ندارد ــــ ہیں یہ کیا ہوا۔ سونے کی گھڑی جواہرات سے مرصع ــــ غائب ــــ انہیں خوب یاد تھا کہ سوتے وقت انہوں نے میز پر رکھدی تھی اس وقت ساڑھے بارہ بجے تھے۔ پھر بھی بہ نظر احتیاط انہوں نے کوٹ کی جیب میں اور بیگ میں دیکھا مگر وہاں بھی نہ تھی ــــ دھک سے رہ گئے۔ مرحوم بیوی کی نشانی ــــ جان سے زیادہ عزیز ــــ بڑے پریشان ہوئے۔ یا تو خود شکار کرنے جا رہے تھے یا راستہ ہی میں شکار ہو گئے ــــ اسی سوچ میں تھے کہ انہیں یکایک خیال آیا کہ ...... غنودگی میں انہیں ایسا معلوم ہوا تھا جیسے کوئی درجہ میں داخل ہوتا ہے۔ مگر داخل ہونے کی آہٹ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے زیادہ نہ تھی۔ پھر طوفان میل جیسی تیز رفتار گاڑی میں جو ضرورتاً بھی تیز چلائی جا رہی تھی۔ کسی کی مجال ہے جو چڑھ سکے ــــ مگر انہوں نے ٹائم ٹیبل اٹھا لیا اور دیکھا کہ ساڑھے بارہ سے ایک تک کون کون سے اسٹیشن پڑتے ہیں۔ صرف ایک چشم پور ــــ اس پر گاڑی رکتی نہ تھی۔ اگلا اسٹیشن مرغوب پور تھا۔ گاڑی رکتے ہی وہ اسٹیشن پر اتر پڑے۔ پلیٹ فارم کی گھڑی

میں دیکھا خیال کے مطابق ایک بجکر دس منٹ آئے تھے ــــ گارڈ سے کہا کہ میں یہیں اتر دنگا۔ میرے درجہ میں سامان ہے اس کی حفاظت آپ کے ذمہ ہے اگلی گاڑی میں آجاؤنگا "ــــ گاڑی چند منٹ رُکی اور چلدی ــــ

خان صاحب اپنا سگار دانتوں میں دبائے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے ــــ چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سوچ میں ہیں ــــ کس کا کام ہوسکتا ہے "ــــ یہ سوال بار بار۔ ان کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔ آخر کچھ فیصلہ کر کے اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی طرف چلے۔ اپنا کارڈ دکھایا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ اس سے پوچھا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ چشم پور کے ریلوے اسٹاف میں کل کتنے آدمی ہیں "

"تین" اس نے کہا وہ تو بہت چھوٹا سا اسٹیشن ہے بس دو ایک گاڑیاں ٹھہرتی ہیں "۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"اور قلی!"

"قلی کوئی نہیں ہے۔ وہاں کوئی ایسا مسافر اترتا ہی نہیں جسے قلی کی ضرورت ہو"

"مرغوب پور پر آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ طوفان کتنی دیر ٹھہرا"

"ویسے تو زیادہ ٹھہرتا مگر آپ کی ہدایت کے مطابق صرف تین منٹ ٹھہرا" ــــ اسٹیشن ماسٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا!" خاں صاحب نے کہا اور کسی خیال میں غرق ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور کہا "اچھا تو آپ اپنے اسٹیشن کے کُل قلیوں کو پلیٹ فارم

پر جمع کر دیجئے مجھے اپنے کیس کے متعلق کچھ تحقیق کرنا ہے۔"
"اچھا تھوڑی دیر ٹھہریئے۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا اور باہر چلا گیا پھر کچھ وقفہ کے بعد واپس آیا اور کہا کہ سب قلی موجود ہیں تشریف لایئے۔"
دفتر سے باہر نکل کر خانصاحب نے قلیوں پر ایک نظر ڈالی۔ جو دُور تک ایک لائن میں کھڑے تھے۔
"آج کوئی قلی غیر حاضر تو نہیں ہے؟" خانصاحب نے پوچھا۔
"ایک قلی نمبر ۱۲۵ غیر حاضر ہے۔ کچھ علیل ہے۔ آج وُہ اسٹیشن پر بھی نہیں آیا۔"
"اسے بھی چند منٹ کیلئے اگر ہو سکے تو بلا دیجئے۔ تمام قلیوں کا حاضر ہونا اشد ضروری ہے۔"
"دیکھئے میں کوشش کرتا ہوں۔ اسٹیشن ماسٹر نے کہا اور ایک قلی کو بھیجا کہ قلی ۱۲۵ نمبر کو بلا لاؤ۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گیا۔ یہ رحیم تھا۔ چہرہ پُرسکون اور آنکھوں میں اطمینان کی جھلک تھی۔
وہ بھی آخری سرے پر کھڑا ہو گیا۔ خانصاحب نے ہر ایک قلی کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ وہ اِتنی گہری نظر سے دیکھتے کہ جو آنکھوں کی راہ دِل میں اُتر جاتی — ہر قلی برداشت بھی نہ کر سکتا اور گھبرا کر اپنی نظریں پھیر لیتا۔ ایک ایک کو دیکھتے ہوئے وہ ۱۵ اخیر تک آ گئے — اب دو قلی باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے پہلے کو غور سے دیکھا وہ تاب نظر نہ لا سکا اور نظریں پھیر لیں — خانصاحب آگے بڑھ گئے۔ اب رحیم کی باری تھی — تمام قلیوں کے چہرہ سے انتہائی

نفرت برس رہی تھی — خان رحیم کو بھی دیکھنا چاہتا ہے — ان کا بس نہ تھا کہ خانصاحب کی بوٹیاں نوچ ڈالیں — انہیں اپنی پروا نہ تھی مگر رحیم پر وہ کسی قسم کی آنچ نہ آنے دے سکتے تھے۔

خانصاحب نے رحیم کو دیکھا — انتہائی متانت — سنجیدگی — پختگی کے ساتھ — سفید ریش ایک جلالی منظر پیش کر رہی تھی۔ ہونٹ متبسم — آنکھوں میں ایک خاص چمک — اس چمک کو بوڑھا جاسوس پینتالیس سال سے دیکھتا آرہا تھا۔ خانصاحب نے ایک کڑی نظر سے رحیم کو دیکھا۔ دوسرا ہوتا اس نظر کو برداشت نہ کر پاتا۔ مگر رحیم ان دل کے پار ہو جانیوالے تیروں کا اطمینان سے مقابلہ کرتا رہا۔ گویا کوئی خاص بات نہ تھی — خاں صاحب نے اس اطمینان اور سکون کو بغور دیکھا — اور پھر دیکھا — آنکھوں نے گواہی دی اور تجربہ نے تصدیق کی — فوراً اپنے مضبوط ہاتھوں سے رحیم کا گریبان پکڑ لیا — تمام قلیوں میں ایک شور مچ گیا — رحیم کے تقدس سے اسٹیشن ماسٹر بھی واقف تھا — اس نے خان صاحب سے انگریزی میں کہا۔

"خان صاحب آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی — یہ قلی انتہا درجہ کا نیک اور پارسا ہے — میں ذاتی طور پر اسے عرصہ سے جانتا ہوں دیکھئے قلیوں میں اس حرکت بے جا پر کیسی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔"

"براہِ مہربانی آپ دخل نہ دیجئے" خانصاحب نے کچھ نرمی اور کچھ درشتی سے کہا —

قلیوں نے رحیم کو دیکھا وہ اب بھی بلا کسی مزاحمت کے ویسے ہی کھڑا تھا۔

اگر وہ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو وہ خان کی تکا بوٹی کر دیں ——— بعد کی بعد میں دیکھی جائیگی ———

مگر انہوں نے انتہائی حیرت سے دیکھا کہ خان کا ہاتھ رحیم کے کُرتے کی اندر کی جیب میں گیا ——— اور دُوسرے سیکنڈ میں خان کے ہاتھ میں سُنہری جواہر سے مرصّع گھڑی ڈھائی بجا رہی تھی ———!!!

بہن

چھٹیوں کا زمانہ تھا اسکول بند ہو چکا تھا میں بھی گھر آگیا تھا۔ یہاں گاؤں میں میری طبیعت نہ لگتی تھی۔ دن بھر اپنے کمرے جو لب سڑک تھا پڑا ہوا یا تو رسالے دیکھتا یا شام کے وقت بستی سے دُور ٹہلنے چلا جاتا۔ گاؤں سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے اس کے قریب ہی ندی بہتی ہے۔ شام کے وقت جب سورج شہتوت کے درختوں کے پیچھے چھپ جاتا۔ گہری نارنجی اور سنہری شعاعیں گھنے پتوں میں سے چھن کر ندی کی مرتعش لہروں میں پڑتیں تو عجب دلکش سماں پیدا ہوتا۔ مجھے دُنیا میں دو ہی چیزوں سے دلچسپی ہے ——— کتابوں سے یا قدرتی مناظر سے ——— میں گھنٹوں شام کے وقت وہاں بیٹھا ہوا یہ منظر دیکھا کرتا۔ جب سورج آہستہ آہستہ چھپ جاتا۔ رات کی سیاہی پہاڑ

کے پیچھے سے آہستہ آہستہ اٹھ کر سامنے آتی تو میں بھی قدرت کی رنگینیوں اور دلچسپیوں میں کھویا ہوا گھر واپس آجاتا۔

ایک دن میں حسب عادت صبح کے ناشتہ کے بعد کمرے میں لیٹا ہوا رسالہ دیکھ رہا تھا۔ دروازے پر ہلکا نیلا پردہ پڑا تھا۔ سڑک پر بچے بہت شور مچا رہے تھے۔ شاید کچھ کھیل رہے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں دُنیا کی کثافت اور مشکوک نگاہوں سے دُور گاؤں کی پاک وصاف فضا میں کھیل رہے تھے۔ ان کے شور سے گھبرا کر میں نے رسالہ بند کر دیا اور دروازہ کے پاس آکر پردہ ہٹا کر تماشہ دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے معصوم فرشتے زمین پر اتر آئے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں دس گیارہ برس تک کی عمر کے سب اپنی معصومانہ حرکات اور طفلانہ شوخی سے محلہ کی خاموشی میں زندگی کی لہر دوڑا رہے تھے۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ میری یہ دلچسپی ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ میں اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ گھر کی خاموش فضا تھی اور میں میرے خالو لاہور میں رہتے تھے۔ جب کبھی وہ خالہ اور ریحانہ آجاتیں تو چہل پہل ہو جاتی ان کے بعد پھر وہی گھر وہی روزانہ کے کام ——— مگر ان کے آنے سے میری تنہائی دُور نہ ہوتی کیونکہ ریحانہ تھی تو میری خالہ زاد بہن مگر اسے شاید وہ کسی اور دُنیا کی رہنے والی تھی۔ میری اور اسکی طبیعت میں مشرق اور مغرب کا فرق تھا لیکن پھر بھی ایک سے دو بھلے ضرور ہو جاتے۔ جب میں دو بھائی بہنوں کو گلے میں باہیں ڈالے میلے میں جاتے دیکھتا تو میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی جسے میں خود بھی نہ سمجھ سکتا مگر شاید وہ اس چیز کی کمی سے پیدا ہوتی جسے عام طور پر بھائی بہن

کہتے ہیں۔ جب دونوں مدرسے جاتے یا ایک دُوسرے کی اُنگلیاں پکڑے ہُوئے بازار سے واپس آتے تو میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر رہ جاتا۔
جب میں آٹھ سال کا تھا تو مجھے اسکول میں بھیجدیا۔ گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا اس لئے گھر سے دُور بورڈنگ میں رہنا پڑا۔ وہاں استادوں کی شفقت اور ساتھیوں کی محبّت نے تنہائی تو رفع کر دی۔ مگر وہ خواہش اب بھی باقی تھی۔ اور رات کو جب سب کام ختم ہو جاتے میں اپنے بستر پر سونے کے لئے لیٹ جاتا۔ کھڑکی کی راہ سے ٹھنڈی ہوا کے خوش گوار جھونکے رات کی رانی کی خوشبُو میں بسے ہُوئے چُپکے سے مجھے کچھ کہتے! اور میرے دل میں ایک بار وہ خواہش پھر پیدا ہو جاتی۔ سوتے میں سہانے وشیریں خواب نظر آتے۔ کبھی میں اپنی بہن کی اُنگلی پکڑے ہُوئے گاؤں سے دُور دریا کے کنارے ٹہلتا۔ پہاڑی ڈھالوں سے اُترنے والے بکریوں کے ریوڑ گرد وغبار۔ بکری کے بچوں کی میں میں۔ نگہبان کتے کی بھوں بھوں اور پھر گڈریے کی بانسری کی آواز ہم دونوں سُنتے اور پھر اسی طرح ٹہلتے ہُوئے واپس آ جاتے کبھی میں دیکھتا کہ میں گھر پہ باغ میں بیٹھا ہُوا پڑھ رہا ہُوں اور کبھی شریر لڑکی نے آ کر اپنی ننھی اور نازک اُنگلیوں سے میری آنکھیں بند کر لیں۔ میں سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بنکر ہنستے ہُوئے کہتا۔ ارے یہ کون ہے جو ہمیں روز روز آ کر پریشان کرتا ہے —— اچھا دیکھو چھوڑ دو۔ نہیں ہم اب کے بورڈنگ سے نہیں آئیں گے۔ میری پیاری بہن ہنستی ہوئی آنکھیں چھوڑ دیتی۔ اتنے میں میری آنکھ کھُل جاتی۔ وُہی سنسان کمرہ اور وہی سرد بستر۔

(۲)

میں بڑی دیر تک ان بچوں کا کھیل دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں نے پردہ چھوڑ دیا اور پھر اپنی تنہائی کا غم غلط کرنے کے لئے اخبار دیکھنے لگا۔ سڑک پر شور بھی اب کم ہو گیا تھا۔ شاید وہ کھیلتے کھیلتے تھک گئے تھے۔ میں نے پردہ میں سے جھانک کر دیکھا تقریباً سب اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ میں پھر اخبار میں کھو گیا۔ یکایک کمرے میں پردہ ہٹنے سے روشنی بڑھ گئی میں نے دیکھا کوئی جالیوں میں سے ہاتھ بڑھائے ہوئے پردہ کو پکڑے ہوئے ہے۔ میں یہ دیکھ کر مسکرایا۔ اور اُٹھنے کا ارادہ کیا مگر پردہ پھر اصلی حالت پر آ گیا۔ میں پھر پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی نے پردہ ایک طرف سے پکڑا۔ میں دبے پاؤں دروازہ تک آیا اور آہستہ سے میں نے پردہ میں سے اس ہاتھ کو پکڑ لیا جو دیر سے میری دلچسپیاں اپنی طرف مبذول کئے ہوئے تھا۔ ”اوئی اللہ“ کی نازک سی آواز کے ساتھ کسی نے ہاتھ کھینچا۔ میں نے اپنی گرفت ذرا مضبوط کر لی۔ اس نے ذرا زور لگایا۔ چٹ سے ایک چوڑی ٹوٹ گئی۔ ”ارے دیکھئے میری چوڑی ٹوٹ گئی۔ چھوڑ دیجئے۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔ اب میں نے پردہ ہٹا دیا۔ میرے سامنے وہی معصوم صورت تھی جو چند منٹ پہلے ہلکا نیلا دوپٹہ اوڑھے ہوئے کھیل میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ میں نے کہا ”اچھا تم ہی ہو جو مجھے اتنی دیر سے تنگ کر رہی ہو۔ اچھا دیکھو اب کے ایسا مت کرنا۔“ کہہ کر میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے ایک دفعہ اپنی ٹوٹی ہوئی چوڑی کو دیکھا پھر مجھے دیکھ کر زور سے ہنسی اور بھاگ گئی۔

(۲۳)

دوپہر کو میں کھانے کیلئے اندر گیا۔ امّی نے کہا۔ "اے ہے کیسا لڑکا ہے ہر وقت کمرے میں گھسا ہوا کتابوں سے لپٹا رہتا ہے۔ یا بہت ہوا تو جنگل بیابان میں نکل گیا اور بس"۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا امی! کہئے آپ کو کیا کام ہے۔ میں تو ہر وقت گھر ہی میں موجود رہتا ہوں"۔

"مجھے کیا کام ہوتا۔ مگر گھر میں جب کوئی آیا کرے تو اس کو سلام تو کرلیا کر۔ تو تو پڑھ لکھ کر بھی بالکل گدھا ہی رہا۔" اب میں نے بائیں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے چارپائی پر عنابی رنگ کے دوپٹے میں کوئی نظر آیا۔ میں نے نظریں نیچی کر لیں پھر دیکھا اور بہت جھک کر سلام کیا۔ یہ ہماری بی ہمسائی امی کی منہ بولی بہن تھیں انہوں نے دعائیں دیتے ہوئے اور بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "بڑا سعادت مند بچہ ہے۔ کیسا نیک ہے شہر کی ہوا ذرا بھی تو نہیں لگی (اماں سے مخاطب ہوکر) بہن اب کے برس کا ہوگا۔ ہماری پروین سے دو سال بڑا ہے۔ ماشاءاللہ بارہ برس کا ہوگا۔ خدا عمر دراز کرے۔" پھر دائیں بائیں دیکھ کر "اری پروین کہاں بھاگ گئی بھائی کو سلام نہیں کیا شریر کہیں کی۔" سامنے کے برآمدے میں سے نیلے دوپٹے میں مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ جیسے صاف آسمان میں چودھویں رات کا چاند۔ جھجکتی ہوئی میرے قریب آئی اور مسکرا کر کہا۔ "سلام بھائی قمر جان" میں آسے دیکھ کر ایسا مبہوت ہوا کہ جواب دینا بھی بھول گیا۔ وہی نازک ہاتھ جو چند گھنٹے پیشتر میرے کمرے کا پردہ پکڑے ہوئے تھے۔ سلام کر رہے تھے میں حیران نہ معلوم کن خیالات میں گم ہوگیا۔ کہ خالہ اماں (بی ہمسائی) نے کہا

"بیٹھ جاؤ بیٹا" میں اسی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ پروین بھی اس کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی۔ خالہ اماں بڑی دیر تک مجھ سے اسکول، پڑھائی بورڈنگ کے متعلق پوچھتی رہیں۔ پروین بڑی سنجیدہ صورت بنائے سب سن رہی تھی۔ میری نظریں نیچی تھیں۔ مگر نہ معلوم کیوں میری نگاہیں بے اختیارانہ اس کے چہرہ کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ میں نے اب غور سے اسے دیکھا۔ کچا کچا حسن جیسے سیب کا نورستہ پھل۔ کانوں میں خوشنما آویزے جیسے چاند کے نزدیک دو بے قرار تارے۔ میں نے پھر نظریں جھکا لیں۔ ایک بار میں نے پھر دیکھا۔ شاید وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی نظر ملتے ہی مسکرا کر جھکا لیں۔ میرے دل کے کسی اندرونی گوشہ میں ایک سوئی ہوئی خواہش پھر بیدار ہوئی۔ میں نے دل میں کہا کاش ایسی ہی ایک میری بھی بہن ہوتی۔

خالہ نے چلتے وقت میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا کبھی کبھی ہمارے گھر بھی ہو جایا کرو۔ تمہیں دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے۔"

امی نے کہا "ہاں ہاں بیٹا ہو آیا کرو ــــ بری بات ہے"۔ میں نے کہا "شام کو ضرور آؤنگا۔"

چلتے وقت پروین نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا "بھائی جان سلام"۔ میں نہ معلوم کیوں جھینپ گیا۔

(۴)

شام کو میں پروین کے گھر گیا۔ تھوڑی دیر تک تو میں پروین اور خالہ اماں باتیں کرتے رہے پھر خالہ اماں اٹھ کر گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ پھر میں اور

پروین باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسرے سے ایسے مانوس ہوگئے جیسے پُرانے دوست۔ گھر میں پروین خالہ اماں اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ پروین کے ابا دوسرے شہر میں نوکر تھے۔ پروین کے بھی کوئی بھائی یا بہن نہ تھا۔ اس کو بھی بالکل میری طرح ایک بھائی کی ضرورت تھی۔ ہم دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہوگئی اور گھر سے نوکر بلانے آیا۔ گھر آکر امی نے کہا ایسے جاکر بیٹھ رہے کہ آنے کا نام نہیں لیا۔ یا تو کبھی جائینگے نہیں اور جائیں گے تو بس وہیں کے ہو رہینگے۔" میں مُسکرا کر چُپ ہوگیا۔ آج میں بڑا خُوش تھا۔ میری دیرینہ خواہش پُوری ہوگئی۔ آج مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر معلوم ہوگئی۔

میں نے کھانا کھاتے میں اماں سے کہا۔" امی پروین بڑی اچھی لڑکی ہے" ہمارے بھی ایک ایسی ہی بہن ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔"

امی نے زیرِ لب مُسکراتے ہوئے کہا۔" ہٹ پگلے۔ پروین تیری بہن ہی تو ہے۔"

یہ بات سُن کر میرا دل پھُولا نہ سمایا۔ اب میں روز صبح سے ہی پروین کے گھر چلا جاتا وہاں ہم دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ میں اسے بورڈنگ اسکول وہاں کے لڑکوں کا حال سُناتا۔ وہ بڑے شوق سے سُنتی۔ پھر وہ اپنی کتاب لے آتی میں اسے پڑھاتا۔ دونوں اس کی تصویریں دیکھتے۔ میں کسی رسالہ میں سے اسے افسانے سُناتا کبھی پروین ہمارے گھر آجاتی وہاں ہم دونوں باغ میں کھیلتے رہتے کیاریاں بناتے اس میں پودے لگاتے۔ غرض دن اسی طرح گذرتے گئے پروین

کے مل جانے سے مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے واقعی ہم دونوں بہن بھائی ہی ہیں۔

(۴)

چھٹیاں ختم پر تھیں۔ میں اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ وہ میرے رومال پر پھول کاڑھ رہی تھی میں نے رسالہ پڑھتے ہوئے اسے پکارا۔ "پروین!"

اس نے ہاتھ روک کر چونکتے ہوئے کہا۔ "کیا ہے بھائی جان!"

"میں تم سے ایک بات تو کہنا بھول ہی گیا۔ اب میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔"

"تو پھر اب آپ چلے جائیے گا۔" جیسے کوئی آئندہ خطرے کے احساس سے چونک جائے اس طرح اس نے چونکتے ہوئے بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں تو پھر میں دو ایک روز میں چلا جاؤں گا۔"

"دو ایک روز میں" اس نے زیر لب کہا اور متفکر ہو کر سر جھکا لیا۔

میں نے پوچھا "کیوں پروین کیا ہوا؟"

"وہاں جا کر آپ ہمیں بھول تو نہ جائیے گا۔" اس نے سر اٹھا کر مغموم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہٹ پگلی کوئی بھی اپنی بہن کو بھول جاتا ہے جو میں تجھے بھول جاؤنگا۔"

یہ سن کر وہ مسکرانے لگی اور پھر کاڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

(۵)

آخر وہ دو ایک روز بھی پورے ہو گئے۔ میں شام کی گاڑی سے دہلی جا رہا

تھا۔ پروین صبح ہی سے آگئی۔ میرا اسباب باندھا۔ کپڑے ٹھیک کیے۔ کتابیں تولیہ برش، منجن، صابن، ہینڈ بیگ میں رکھا سب سامان ٹھیک کر دیا۔ مگر آج خلافِ معمول وہ مغموم اور سست تھی۔ میں نے پوچھا پروین سست کیوں ہو رہی ہو"

امی نے بھی کہا "ہاں بیٹی آج سست کیوں ہو۔ کیسی طبیعت ہے۔"

"کچھ نہیں میں تو بالکل اچھی ہوں۔" پروین نے ٹالتے ہوئے کہا۔ اور ناشتہ دان میں ناشتہ رکھنے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

میں نے جاکر اس سے پوچھا۔ "کیوں پروین آخر بتاؤ تو آج کیا بات ہے۔"

اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا "اب آپ کب آئیں گے"

"اوہ اب میں سمجھا تم میرے جانے سے رنجیدہ ہو رہی ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں میں اب دو مہینے بعد چھٹیوں میں آؤں گا۔"

"دو مہینے بعد۔۔۔ اچھا۔۔۔ میرے خطوں کا جواب دیں گے آپ۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ اپنی بہن کو کون جواب نہیں دیتا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تم بھی میرے خطوں کا جواب دو گی۔"

"اپنے بھائی کے خطوں کا جواب کون نہیں دیتا۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

رات تک وہ ہمارے گھر ہی رہی۔ جب تانگہ میں میرا سامان رکھ دیا گیا۔ اور میں اماں سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا "خدا تمہیں خیریت کے دوبارہ لائے۔"

میں چلنے لگا پروین مجھے دروازہ تک پہنچانے آئی۔ چلتے وقت اس نے

کہا "بھائی جان سلام"

"میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے میرا دل بھی اس وقت بھاری ناؤ کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا "سلام پروین" اور جلدی سے تانگہ میں بیٹھ کر اپنے گرنے والے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا۔ جب تک تانگہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا۔ وہ مجھے برابر دیکھتی رہی۔

(۵)

اسکول میں جا کر میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں سوچتا کاش ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول ہوتا اور میں وہاں پڑھتا اور اپنی پیاری پروین سے الگ نہ ہوتا۔ دسمبر دن اسکول کی چھٹی تھی۔ میں اپنے کمرے کے آگے لان پر کرسی ڈالے نیم دراز تھا۔ دسمبر کے مہینہ کی خنک مگر خوشگوار ہوا چل رہی تھی سنہری دھوپ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ سبزہ کے مخملی فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں بظاہر تو کرسی پر دراز تھا مگر درحقیقت وہاں سے بہت دور گاؤں کی رنگین فضاؤں میں کھویا ہوا تھا۔ اور تصور میں پروین کے کمرے میں لیٹا ہوا اسے افسانہ سنا رہا تھا۔

"لیجیے بابوجی آپ کے نام کا ...." ڈاکیہ کی کرخت آواز سنائی دی میں ایک دم چونک پڑا ... "خط ہے"۔ اپنا جملہ پورا کرتے ہوئے ڈاکیہ نے ایک ہلکے آسمانی رنگ کا نازک سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خط لیکر پتہ پڑھا۔ مہر بھی۔ گاؤں سے آیا تھا۔ یہ خط میرے لیئے کوئی نئی چیز نہ تھی ہمیشہ گاؤں سے خط آیا کرتے تھے۔ مگر اس لفافہ میں نہ معلوم کیا کشش تھی کہ میں چند

منٹ پتہ پر جو کسی کی خوشی تحریر کی غمازی کر رہا تھا۔ نظر جمائے رہا۔ اپنے نام سے پہلے بھائی جان کے لفظ میں نہ معلوم مجھے کیا کیا مسرتیں رقصاں نظر آرہی تھیں۔ خط چاک کر کے میں نے پڑھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "بھائی جان سلام۔ جب سے آپ گئے ہیں میرا جی نہیں لگتا۔ امّاں جان بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہاں آپ کیا کرتے ہیں۔ اب کب آئیے گا؟" میں بہت دیر تک خط پڑھتا رہا۔ کئی بار پڑھا اور پھر ایک مرتبہ تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔

پروین کے خط ہر تیسرے چوتھے روز آتے تھے میں بھی فوراً جواب دیتا۔ کبھی وہ لکھتی "شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم نے اور آپ نے جو کیاریوں میں گلاب لگائے تھے اب ان میں کلیاں آگئی ہیں دو ایک روز میں پھول بھی آجائینگے۔ میں روز صبح اٹھ کر منہ اندھیرے ان کو پانی دیتی ہوں۔ ہماری گائے نے جس کا نام آپ نے موہنی رکھا تھا بچھڑا دیا ہے۔ وہ بہت چلاتا ہے۔ شاید آپ کو یاد کرتا ہے؟"

جب میں پروین کا خط پڑھتا اسکول کی تمام کوفت دور ہو جاتی۔ میں سمجھنے لگتا کہ میں دنیا میں اکیلا نہیں ہوں۔

چھٹیاں ہوئیں میں گاؤں گیا۔ پروین کے لئے آویزے لے گیا۔ میں نے اسے پہنا کر کہا "پروین تم کتنی اچھی ہو، آہا!"

"اور آپ کتنے اچھے بھائی ہیں!" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا حقیر تحفہ بھی قبول ہوگا" کہتے ہوئے اس نے ایک خوبصورت ریشمی رومال جس کے کونے پر "راحت" خوبصورت پھولوں کے گنج میں چمک رہا تھا

میرے ہاتھ میں دیدیا۔

میں نے شرارتاً کہا "تم نے میرا نام کس کی اجازت سے کاڑھا"۔

"اور آپ میرے لئے بُندے کس کی اجازت سے لائے"۔ اس نے مُسکرا کر جواب دیا۔ میں لاجواب ہوکر رہ گیا۔

(۶)

چھٹیاں ختم ہونے پر میں دہلی واپس آگیا۔ پروین کے خط برابر آتے رہتے تھے۔ میں فرصت کے اولین لمحات میں خط کا جواب دیتا۔ امی بھی اپنے خطوں میں لکھتیں کہ پروین تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

عیش و مسرت کے دن کتنی جلدی گذر جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ۵ سال گذر گئے۔ میں اسکول کی محدود فضا سے نکل کر کالج کے وسیع میدان میں آگیا۔ نئی دُنیا، نئی دلچسپیاں، نئے ساتھی، نئی امنگیں مگر میں ہنوز پُرانا تھا۔

پروین بھی عہدِ طفلی سے شباب کی سمت آرہی تھی۔ اب اس کے خطوں میں ایک خاص قسم کی چاشنی ہوتی تھی۔ میں پڑھتا اور دیر تک لطف اندوز ہوتا جیسے ایک بچہ اپنی بہن سے کوئی دلچسپ کہانی سُن کر اپنے آپ کو بھی اسی رنگین ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ بالکل ایسے ہی میں پروین کے خط پڑھتا اور اس کی شوخیٔ تحریر اور رنگین بیانی سے محظوظ ہوتا۔

ایک خط میں اس نے لکھا "اب تو آپ کالج میں آ گئے ہیں۔ "نئے ساتھیوں" اور کالج کی رومانی فضا میں مجھے فراموش نہ کیجئے گا"۔

میں نے اسے لکھا۔ "بہن پروین تم بھی کتنی ننھی ہو۔ وہ صرف میرے ساتھی

ہیں اور تم میری بہن ہو۔ کتنا فرق ہے تم میں اور ان میں۔ اب تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ کون بھلایا جا سکتا ہے اور کون یاد رکھا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تم اپنے "گھر جا کر مجھے بھول جاؤ"۔

پروین نے کہا۔ "بھائی جان آداب آپ نے لکھا ہے کہ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے گھر جا کر مجھے بھول جاؤ ــــ اپنے گھر سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا میں اب اپنے گھر میں نہیں ہوں ــــ اچھا اب میں سمجھی۔ اپنے گھر سے آپ کا یہ مطلب ہے نا کہ جب میرا ــــ میرا بیاہ ہو جائے گا ــــ ہیں نا۔ آپ بڑے وہ ہیں۔ دیکھئے آئندہ بس ایسی بات نہ لکھئے گا"۔

ہم اسی طریقے سے آپس میں خط و کتابت کرتے رہے۔ ایک مرتبہ خلافِ معمول اس نے خط کا جواب نہ دیا۔ عام طور سے تیسرے روز جواب آ جاتا تھا۔ مگر اب پانچواں روز تھا ابھی تک جواب نہیں آیا۔ میں بہت پریشان تھا خدا معلوم کیا حادثہ پیش آیا۔ چھٹے روز مجھے جواب ملا۔ بہت مختصر اور مجمل ــــ

بھائی جان آپ نے نہ معلوم کیا کیا شکوک میرے جواب نہ دینے سے پیدا کئے ہونگے۔ مگر کاش آپ میری مجبوری سمجھ سکتے۔ کچھ لوگ اب ہماری آپ کی خط و کتابت پر اعتراض کرتے ہیں۔ "آپکی پروین"

اعتراض کرتے ہیں؟ ہماری خط و کتابت پر! کیوں؟ کیا ایک بھائی اپنی بہن کو خط نہیں لکھ سکتا؟ کیا یہ جرم ہے؟ آخر کیوں؟ میں ابھی خیالات کی گتھیاں سلجھا رہا تھا کہ میری نظر دوسرے لفافہ پر پڑی جو پاس ہی گھاس پر پڑا تھا یہ امّی کا خط تھا ــ کیا لکھا تھا ــــ بس کچھ نہ پوچھو۔ وہی امّی جنہوں نے

یہ کہا تھا کہ اب بہن بنالے تیری بہن ہی تو ہے۔ آج خط میں لکھ رہی ہیں —
"بیٹا تم کچھ ناسمجھ نہیں ہو۔ بچپن کا زمانہ ناسمجھی کا ہوتا ہے۔ جب ریت کے مکان بنا کر محل سمجھتے ہیں اور ٹھیکری کے ٹکڑے روپہلی و سنہری سکوں سے زیادہ بیش قیمت نظر آتے ہیں۔ تم کالج میں پڑھ رہے ہو۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو۔ میں نے مانا کہ پروین کو تم بہن سمجھتے ہو۔ مگر اور لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے۔ ابھی چند روز ہوئے۔ ماما آئی۔ کام کرنے کے بعد میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرکے بولی بی بی جی ایک بات کہوں اگر ناراض نہ ہوں تو۔ میں نے کہا کہا ضرور کہو۔ تو اس نے رُکتے رُکتے اتنی بات کہی کہ تحصیلدار صاحب کی منّی (پروین) کے پاس چھوٹے میاں (میں) کے کچھ خط اور ایک تصویر نکلی تھی۔ وہ بڑے ناراض ہو رہے تھے۔ وہ تو اتنا کہہ کر چپ ہو گئی میں نے بہتیرا پوچھا مگر اس نے اور کچھ نہ بتایا۔
میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی کہ کچھ نہ کچھ شگوفہ ضرور پھوٹے گا۔ تم سمجھدار ہو اب خود خیال رکھنا۔"

میں خط پڑھ کر سناٹے میں آگیا۔ سر سے پاؤں تک گویا برقی رو دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے زمین آسمان مکان، در و دیوار درخت بڑے زور سے گھوم رہے ہیں، چاند تارے سورج بڑی تیزی سے گردش میں آ رہے ہیں۔ اجرام فلکی ایک دوسرے سے ٹکرا کر عنقریب فنا ہو جائینگے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے رات ہو رہی ہے۔ اور بس — آدھے گھنٹہ بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کرسی پر پڑا ہوا ہوں اور باوجود ماہ دسمبر کی خنک ہوا کے میں سر سے

پاؤں تک پسینہ میں ڈوبا ہوا ہوں۔ بڑی دقت سے میں اپنے کمرہ میں آکر پلنگ پر لیٹ سکا۔ میں نے سوچا آخر ایسا کیوں ہے۔ مجھ میں یا پروین میں اب کونسی نئی بات پیدا ہو گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب ہم بچپن کے معصوم دور سے نکل کر جوانی کے حدودِ ہوش میں آگئے ہیں اور بس — لوگ کیا خیال کرتے ہیں۔ کیا سب کے دل اس درجہ تاریک ہیں کہ وہ سوائے گناہ کے خلوص و اُلفتِ صادق کا خیال تک نہیں کر سکتے۔ میری اور پروین کی محبت پر کیوں شک پیدا ہوتا ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ ہم دونوں جوان ہیں، اور غیر ہیں۔ کیا ایک عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے علاوہ کوئی تعلق نہیں قائم ہو سکتا — افسوس دنیا کی نظریں کسقدر ظاہر بین ہیں۔ پروین پہ کیا گذری ہوگی؟ — میں جانتا تھا کہ پٹھانوں کی قوم میں جذبۂ غیرت اور ساتھ ہی ساتھ بدگمانی کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ وہ دُنیا بھر کی باتیں برداشت کرتا ہے لیکن جہاں اسکی غیرت مجروح ہوتی ہو اور جذبۂ قومیت کو ٹھیس لگتی ہو وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور وہ کر گذرتا ہے جس کی توقع ایک ذی ہوش اور خود دار آدمی سے نہیں کی جا سکتی۔ پروین کے والد تحصیلدار صاحبداد خان سرحدی پٹھانوں میں سے تھے خدا معلوم وہ کیا سمجھے ہونگے اور کیا کیا ہو گا۔

لیکن پروین کے پاس میرا فوٹو کیسے پہنچا۔ میں نے بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کئی روز کے بعد جب میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا۔ تو اچانک خیال آیا کہ اسکول کے زمانہ میں جب میں کرکٹ کیپٹن تھا اس سال فائنل میچ

جیتنے پر ساری ٹیم کا گروپ بھیجا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنا فوٹو الگ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سالانہ تعطیل میں جب میں گھر گیا تو پروین نے جہاں میری جملہ اشیاء کی تلاشی لی وہاں میرے سوٹ کیس پر بھی نظرِ عنایت ہوئی اور وہ تصویر بحق سرکار ضبط کر لی گئی میں نے ہر چند کہا کہ میں تمہیں دوسری دیدونگا یہ میری کیپٹن کے زمانہ کی ہے مگر وہ کہاں سننے والی تھی۔ غرض یہ تصویر وہ تھی۔

کالج میں میری طبیعت بڑی اُلجھتی۔ خدا معلوم محض شک کی بناء بیچاری کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا ادھر امی کا بھی ایک خط ادھر آیا جس میں اس قسم کی باتیں نصیحتیں، رسوائی و بدنامی کا خوف دھمکی اور خدا جانے کیا کیا تھا۔

کئی ہفتہ کے بعد ایک دن کالج کے پتہ پر پروین کا خط ملا۔

"بھائی جان اپنی بدنصیب بہن کا سلام قبول کیجئے۔ آپ کو خالہ اماں (میری امی) کے خط سے بہت سی باتوں کا پتہ ہو گیا ہو گا۔ قصہ یوں ہوا کہ ابا چھٹی لیکر آئے تھے۔ ایک دن میں آپ کے خط کا جواب لکھ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا کیا لکھ رہی ہے۔ میں نے کہا۔ "خط"۔ "کسے"۔ میں نے آپ کا نام لیا۔ انہوں نے سنتے ہی ناک بھوں چڑھائی "راحت! کون راحت؟" میں نے آپ کا پتہ دیا۔ انہوں نے کہا۔ "اچھا وہ۔ اسے کیوں لکھ رہی ہے۔ کیا تعلق اس سے۔ کون لگتا ہے وہ تیرا۔" غرض ان کا غصہ ایک دم بڑھ گیا۔ خدا معلوم وہ کیا سمجھے۔ اور مجھے بہت برا بھلا کہا ملعون مردود، ننگِ خاندان، کلنک کا ٹیکا اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ میں سب سُن ہی

تھی اور خون کے گھونٹ کی طرح پی رہی تھی۔ اور وہ خط پھاڑ ڈالا۔ میں ایک دن عصمت کے گھر گئی تھی۔ ان کو میرے پیچھے جانے کہاں سے وہ آپ کی تصویر مل گئی۔ اس کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ جس وقت میں ڈولی میں سے اتری تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ دنیا بھر کے خطابات مجھے دیئے گئے۔ وہ ابا جنہوں نے مجھے آجتک ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ آج مارنے کو دوڑے وہ تو اماں بیچ میں آگئیں ورنہ آج مجھے خود یہ "اقدام گناہ" نہ کرنا پڑتا۔ بھائی جان دنیا والوں کی آنکھیں سطحی چیزیں دیکھنے کی عادی ہیں ان کی عقل اس درجہ محدود ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک نوجوان مرد و عورت ہر قسم کی خواہشات سے الگ ہو کر بھی مل سکتے ہیں۔ یہ بات ان کی فہم سے بعید ہے کہ وہ دونوں سچی محبت کر سکتے ہیں۔ وہ محبت جو ایک بھائی کو بہن سے ہوتی ہے۔

سماج کے یہ دیوتا جو خود ساختہ خلاف فطرت قوانین کے پیچھے جو ان کی نظر میں اللہ اور رسول کے قانون سے بڑھ کر ہے۔ اسقدر دیوانے ہوئے ہیں کہ وہ محبت کے اصلی مفہوم تک نہیں سمجھ سکتے۔ محبت کے معنی ان کی لغت میں گناہ، معصیت اور عصمت فروشی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ محبت نام ہے ایک پاکیزہ جذبہ کا۔ محبت جسموں کو ملانیوالی نہیں بلکہ روحوں کو ایک کرنے والی ہے۔ محبت اور خواہشات میں شبنم اور آفتاب کا تعلق ہے۔ جس طرح خورشید کی کرن کے سامنے قطرۂ شبنم نہیں ٹھہر سکتا۔ اسی طرح محبت کی چمک اور دمک کے سامنے خواہشات کا سمندر بھی نہیں

رُک سکتا۔ جس طرح تمازتِ آفتاب قطرہ کو بھاپ بنا کر اُڑا سکتی ہے اسی طرح تپشِ محبت بھی خواہشات کے اتھاہ سمندر کو ایک لمحہ میں پایاب کر سکتی ہے۔

خیر بھائی جان۔ مجھ سیاہ بخت کا یہ آخری خط ہے جو آپ کو ملے گا۔ اب میں جا رہی ہوں دُور۔۔۔ بہت دُور۔۔۔ ان سفید بادلوں سے بھی پرے۔ وہاں جہاں سب کو جانا ہے۔ جہاں سے جا کر کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ میں جا رہی ہوں۔ دُنیا والوں کی نظروں سے مگر آپ کی نظروں میں ہمیشہ رہُونگی۔

اچھا پیارے بھائی جان اب اِجازت دیں کیونکہ میرا جامِ زندگی لبریز ہو چکا ہے۔ بس چھلکنے کی دیر ہے۔!!

آپ کی بدنصیب بہن

پروین۔

وقفہ راحت میں یہ خط مجھے ملا۔ خط پڑھتے ہی میری عقل و ہوش پر بجلی سی گر پڑی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ میں سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔ کالج کا گھنٹہ بجا بھی اور ختم بھی ہو گیا۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب کالج کے چپراسی نے نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ کر میرا بازو ہلا دیا۔

میں چونک پڑا۔ میری آنکھیں دِل کے اس سیاہ داغ کو دھونے لگیں میں اسی حالت میں ہوسٹل چلا آیا۔۔۔ آہ

میرے بخت کی تیرگی میں ایک سُورج چمکا تھا مگر سیاہ خوفناک بادلوں نے اسے بھی چھپا دیا ؂

ایک لمحۂ تاریک

رامجی ساہوکار اپنے دفتر میں ایک آرام کرسی پہ نیم دراز لیٹا ہوا تھا۔ وہ ساہوکاری کے کاروبار کو تقریباً پچاس سال سے کامیابی کے ساتھ چلا رہا تھا اور آج شہر کا مشہور ساہوکار گنا جاتا تھا۔

شمالی دیوار کے دریچہ سے آفتاب کی زرد زرد کرنوں کا سیلاب سا بہتا ہوا اندر آرہا تھا۔ رامجی کا زرد چہرہ سورج کی روشنی میں اور بھی زرد معلوم ہو رہا تھا۔ سفید پریشان بال زرد اور افسردہ چہرہ اس بات کے شاہد تھے کہ وہ کچھ بیمار سا ہے۔ اس کی کرسی کے سامنے شاہ بلوط کی بنی ہوئی مضبوط میز پڑی تھی دوسری طرف اس کا خاندانی طبی مشیر ڈاکٹر خان بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تو آپ کچھ بہتر معلوم ہوتے ہیں" ڈاکٹر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دو ایک روز بعد اگر آپ مطب تشریف لے آئیں تو میں اور اچھی طرح تشخیص کر سکونگا۔"

رامجی یہ سن کر مسکرایا اس وقت اس کی عمر ساٹھ سے زیادہ تھی۔ مضبوط بدن گٹھا ہوا جسم اس کی شبانہ روز محنت کے باوجود اس کی صحت کی دلیل تھا اور اسکی کشادہ پیشانی باوجود اس کے پیشہ کے ضرب المثل بخل کے اسکی فراخدلی اور بلند حوصلگی کی نشانی تھی — لیکن ان دنوں وہ کچھ علیل سا تھا —

"اوہ — اب تو میں بالکل اچھا ہوں" اس نے کمزور آواز میں جواب دیا
"یقیناً" "ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب آپ بالکل اچھے ہیں۔ شاید وہ تکلیف خرابیٔ شکم کے باعث تھی۔ میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تو آپ کو اب تک اس قسم کی کوئی شکایت تھی نہیں۔ یہ تو کچھ نئی قسم کی شکایت آپکو پیدا ہو گئی ہے۔"
"ہاں مجھے پہلے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں ہوئی۔ یہ تو ادھر چند ماہ سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ میں آپ کو تکلیف بھی نہ دیتا مگر صرف اس کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ چیز ہے کیا۔ میں بالکل اچھا خاصہ تھا کہ یکایک دماغ کے پچھلے حصہ میں کچھ ایسی شدید تکلیف محسوس ہوتی جیسے — کہ —"
راجی کو اس تکلیف کے اظہار کیلئے الفاظ نہ ملتے تھے آخر وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا "ایسی شدید جیسے کسی نے گرم ہتوڑا دے مارا لیکن یہ صرف ایک سیکنڈ — بلکہ اس سے بھی بہت کم صرف ایک لمحہ ہی باقی رہتی ہے اس کے بعد پھر میں اچھا خاصہ ہو جاتا ہوں۔ جیسے ایکدم بجلی کوند جائے اور بس —"
"ہوں خرابیٔ شکم" ڈاکٹر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "بعض اوقات عجیب وغریب حالات پیدا کر دیتا ہے۔ بہرحال جب آپ آنے کے قابل ہو جائیں تو مطب تک تکلیف کیجئے گا میں اور اچھی طرح اطمینان کر لونگا — غالباً آپ جلد ہی اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے —"
ڈاکٹر نے اپنے سفید دستانے اور ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا — "یقیناً"
راجی مسکرا کر بولا "میں اب بھی بالکل تندرست ہوں کسی قسم کی کوئی

کمزوری اور شکایت محسوس نہیں ہو رہی ——"

"آداب عرض" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور دروازہ سے باہر چلا گیا۔
رامجی پھر اپنی آرام کرسی پر نیم دراز لیٹ گیا۔ یہ کمرہ تہ خانہ کی چھت پر تھا جیسے کہ عام طور پر بنک میں ہوتے ہیں۔ سامنے لوہے کا مضبوط سیف تھا جسمیں رہن رکھنے والوں کے کاغذات تھے۔ لیکن اس کو عام ساہوکاروں کے برخلاف ان کاغذات کی کچھ زیادہ پرواہ نہ تھی۔ وہ پانچ روپیہ سے لیکر بڑی سے بڑی رقم بغیر کسی گواہ کے، بغیر ٹکٹ کے، بغیر ضمانت کے صرف معمولی دستخطوں پر دیدیتا تھا۔ اس کے لئے یہی اعتماد سب سے بڑی ضمانت تھی۔ اسی وجہ سے آجتک اس کا روپیہ کبھی نہیں ڈوبا اور اس کا کاروبار انتہائی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں اسکی بہت عزت تھی۔

ڈاکٹر کے آخری فقروں نے اس کے دماغ میں خیالات کا ایک لا تناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ جیسے مضراب کے لگتے ہی تاروں سے بیتاب نغمے نکلنے لگیں۔

وہ سوچنے لگا کہ اس نے یہ تمام مال، دولت و عالیشان عمارتیں کس قدر مشکلوں اور مصیبتوں سے حاصل کی ہیں۔ اس نے اپنا کاروبار کس قدر معمولی اور ادنیٰ پیمانہ پر شروع کیا تھا۔ اور آج وہ شہر کا سب سے بڑا رئیس اور معزز آدمی تھا —— "وہ ابھی انہی خیالات میں تھا کہ کمرے کا دوسرا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان تندرست خوبصورت بل کھاتی ہوئی مڑی ہوئی مونچھوں کا داخل ہوا۔ یہ اس کا بیٹا شنکر تھا۔ تھا تو اس کا بیٹا مگر اس کا بالکل عکس تھا۔

"پتا جی" ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا۔"

رامجی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر نظر ڈالی اور کہنے لگا "وہ ایک مرتبہ اور فیس لینا چاہتے ہیں۔ مطب میں آنے کو کہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ خرابی شکم کے باعث ہے۔ لیکن میں اچھی طرح اسی کا سبب جانتا ہوں۔ بہرحال اس وقت میں بالکل اچھا ہوں۔"

"ہاں اس وقت تو آپ بالکل تندرست معلوم ہوتے ہیں"۔ شنکر نے کہا اور سامنے پڑی ہوئی شاہ بلوط کی میز کے کونے پر ایک پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "دوسرے کمرے میں چار آسامی آپکا انتظار کر رہے ہیں"۔ شنکر ۲۵-۲۶ برس کا مضبوط جوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں عزم و استقلال کی جھلک تھی لیکن ساتھ ہی اپنے باپ کے برخلاف لالچ کی چمک بھی تھی۔ اس کی پیشانی کی شکنیں اس کی تنک مزاجی کی شاہد تھیں۔ آسامیوں کے معاملہ میں وہ اپنے باپ کے برتاؤ کے بالکل خلاف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان سے جسقدر روپیہ ہو سکے وصول کرنا چاہئے۔ جتنا ہو سکے ان کا خون چوس لیا جائے۔ سود در سود کے چکر میں پھنسا کر ان سے اپنا اصل بھی وصول کر لیا جائے اور ان کی جائداد و مکان بھی ضبط کر لیا جائے۔ غرضکہ وہ ساہوکارانہ سیاست کا پورا ماہر تھا۔

"ایک تو ان میں سے وہ ہے جس نے عرصہ ہوا اپنا مکان رہن رکھا تھا اور اس طرح بات کرتا ہے کہ جیسے اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا ہو۔"

رامجی نے سر ہلایا جیسے وہ سمجھ گیا۔

"دو اور کوئی آدمی ہیں اور ایک ان میں سے وہ بیوہ ہے"۔ اس کے بیٹے نے کہا۔

"اچھا لکشمی دیوی" رامجی نے کہا "نیک عورت ہے آج اس کا آنے کا دن تھا" رامجی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کیوں شنکر میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ کاروبار کا بار نہ اٹھا سکونگا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس کو تمہارے سپرد کر دوں اور خود سبکدوش ہو جاؤں۔ لیکن اس سے قبل میں اس قسم کی آسامیوں........"

"ہاں ہاں" شنکر نے جلدی سے بات کاٹتے ہوئے کہا "یہی میں آپ سے کہنے والا تھا کہ اس عورت کا قصہ تقریباً تین سال سے چل رہا ہے۔ وہ ہمارا اصل تو بہت عرصہ ہوا ادا کر چکی ہے۔ لیکن سود در سود سے اس پر اب بھی قرضہ اتنا ہی باقی ہے۔ اور اسکی میعاد بھی گذر چکی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اب مکان ضبط کر لیا جائے۔"

"نہیں نہیں" رامجی نے کچھ خفگی کیساتھ کہا۔ "میرا یہ مطلب ہرگز نہیں میں اس کو اس کا مکان واپس کرنا چاہتا ہوں۔ بےچاری غریب بیوہ ہے۔ یہی اس کا ایک مکان تھا۔ اب ہمارا روپیہ بھی اصل سے زیادہ ادا ہو چکا ہے۔ پھر وہ کسی مہینہ بھی ایک دن کی بھی دیر نہیں کرتی وقت پر روپیہ پہنچ جاتا ہے۔ اب ہم اس کا مکان واپس کر دیں تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ اور بھگوان کی کرپا سے ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔"

"بھگوان کی کرپا سے" شنکر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ہمارے کاروباری اصول کے بالکل خلاف ہے۔ سود در سود سے تو یہی فائدہ ہے کہ اصلی تو کبھی ڈوبتا ہی نہیں اور چیز بھی اپنی ہو جاتی ہے۔ خیر آپ تو اب آرام کریں گے

میں اس قسم کے جھگڑوں سے ہٹ لونگا۔"

"نہیں اس کا مکان تو میں خود ہی واپس کرونگا۔" راجی نے کہا۔ "اچھا تم اسے میرے پاس بھیجدو۔"

تھوڑی دیر میں مغربی دروازہ کھلا اور ایک کمزور زرد رو عورت میلی سی ساڑھی باندھے ہوئے داخل ہوئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر راجی کو پرنام کیا دوسری بیٹھ گئی۔

"کہو بچے تو اچھے ہیں۔" راجی نے نرم آواز میں پوچھا۔

"بھگوان کی کرپا ہے" لکشمی بائی نے جواب دیا اور نوٹوں کی گڈی راجی کی طرف بڑھائی۔

"کتنے روپے ادا کر چکی ہو تم" راجی نے نوٹ گنتے ہوئے کہا۔

"اصل سے دوسو روپے زیادہ" لکشمی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن شنکر بابو کہتے تھے کہ ابھی کل کا آدھا بھی ادا نہیں ہوا۔"

"خیر یہ آخری قسط ہے۔" راجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آخری" لکشمی نے حیرت سے کہا وہ راجی کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔

"دیکھو میں تمہارا مکان واپس کردونگا۔ اگرچہ شنکر بابو ٹھیک کہتے ہیں لیکن تمہیں اب اور روپیہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں"۔ راجی نے کہا اور...."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ دماغ کے پچھلے حصہ میں یکایک پھر وہ کیفیت پیدا ہوئی جسے وہ ڈاکٹر سے بیان نہ کر سکا تھا — وہی شدید تکلیف جیسے روح کھینچی جارہی ہے۔ آنکھوں کے سامنے یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ لیکن یہ ایک

لمحہ اور بس پھر کچھ نہیں ——

"—— میں تمہارے تمام کاغذات شام کو —— بلکہ کل بھیجدونگا۔" اس نے جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

لکشمی یہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ یہ تمام باتیں اس قدر غیر متوقع تھیں کہ شادی مرگ ہوجانا کچھ بعید نہ تھا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا بڑی بڑی آنکھیں اور بڑی ہوگئیں۔ زرد چہرہ پر مسرت و حیرت کی ملی جلی علامتیں پیدا ہوگئیں۔ اور جب اظہار تشکر کیلئے اس کو الفاظ نہ ملے تو آنکھوں نے موتیوں کے خزانہ لٹانے شروع کر دیئے۔ رامجی یہ تمام علامتیں بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کو اس وقت وہ روحانی سرور اور دلی مسرت حاصل ہو رہی تھی جس کے سامنے اس کو اپنی یہ سالہا سال کی دولت کے سنہرے روپہلے سکوں کے ذخیرہ بھی حقیر معلوم ہو رہے تھے۔

"اب اور کچھ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل تک تمہارے تمام کاغذات بھیج دونگا۔" رامجی نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔

لکشمی بائی نے اٹھکر رامجی کے پیر چھوئے: درپہ نام کر کے دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی۔

رامجی پھر اپنی کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ وہ اپنے خیالات میں غرق تھا کہ گھڑی نے چھ بجائے وہ اٹھکر دوسرے کمرے میں گیا اور شنکر سے بولا۔

"دیکھو ابھی کسی آدمی کے ہاتھ لکشمی بائی کے تمام کاغذات سیف میں سے نکالکر گھر بھیجدو میں رات کو اس پہ غور کرونگا۔"

شنکر نے خیال کیا کہ شاید اس نے اس کی رائے مان لی ہے اور وہ مکان واپس نہ کریگا۔ کہنے لگا۔ "ہاں میرا بھی خیال ہے کہ آپ پھر ایک مرتبہ غور کرلیں۔"
"ہوں میں خوب سمجھتا ہوں" رامجی نے کہا اور زیرِ لب مسکرایا وہ شاید شنکر کا مفہوم سمجھ گیا۔

رامجی کا گھر دفتر سے کچھ زیادہ دور نہ تھا وہ ویسے ہی چہل قدمی کرتا ہوا چلا گیا۔ گھر جا کر اس نے کھانا کھایا۔ کھانے میں وہ برابر سوچ رہا تھا یہ کام جس قدر جلدی ہو کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ نہ معلوم کس وقت کیا بات پیش آجائے۔ صبح سے دو مرتبہ وہ کیفیت ہو چکی ہے۔ جس کو وہ ڈاکٹر تک سے نہ بیان کرسکا۔ اور ڈاکٹر بھی نہ سمجھ پایا۔ "میں ابھی اس کا حساب ختم کئے دیتا ہوں اور باقاعدہ وصولیابی کا کاغذ لکھے دیتا ہوں تاکہ پھر کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہ باقی رہے"۔ اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔ اور اپنی خوابگاہ کی طرف چلا۔ کمرے میں ایک طرف میز بچھی ہوئی تھی اور دوسری طرف مسہری تھی۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل رکھی تھی۔ وہ رات کو دیر تک کام کرنے کا عادی تھا نوکر نے کاغذ میز پر لگا دئے تھے۔ اس نے تمام کاغذات اور حساب کتاب دیکھا۔ پھر دوسرے کاغذ پر مکان کی واپسی اور قرضہ کی بیباقی لکھی جب لکھ چکا تو اٹھا کر دوبارہ پڑھا۔ نظرِ ثانی کر کے اس نے کاروائی باقاعدہ ختم کرنے کیلئے قلم اٹھایا تاکہ اس پر اپنے دستخط کردے۔ ابھی کاغذ پر قلم رکھا ہی تھا۔ اور دستخط کرنا ہی چاہتا تھا کہ دماغ کے پچھلے حصہ میں وہی کیفیت ـــــ شدید ضرب۔ جیسے کوئی مسلسل ہتھوڑے مار رہا ہے ـــــ اس مرتبہ

تکلیف بہت زیادہ شدید تھی۔ دماغ پر تاریکی چھانے لگی۔ آنکھیں بند ہوگئیں
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب رُوح ایک ہی جھٹکے میں تمام بندھن توڑ کر آزاد
ہوجائیگی — قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور وہ کرسی پر سے گر پڑا۔
زینہ میں کسی نوکر نے اس کے گرنے کی آواز سُنی —

(۲)

جب رامجی ہوش میں آیا تو وہ مسہری پر پڑا ہوا تھا۔ وہ نہیں سمجھ سکا۔ کہ
کُرسی پر سے مسہری پر کیسے آگیا۔ آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں تمام واقعات
آنے لگے۔ حساب کتاب دیکھنا۔ قرضہ کاٹنا، وصولیابی اور بے باقی لکھنا۔ پھر
دستخط کیلئے قلم اٹھانا — وہ تکلیف، جانکنی کی سی اذیت، تاریکی، بیہوشی
کرسی پر سے گرنا — شاید بچاری بیوہ کو ابھی کچھ مصیبتیں برداشت کرنا ہیں!
اس کا دماغ رفتہ رفتہ کام کرنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولنی چاہیں
مگر نہ کھول سکا۔ پھر کہنیوں کے بل اُٹھنا چاہا۔ مگر جنبش بھی نہ کر سکا۔ اس نے
شنکر کو پکارا مگر آواز نہ نکلی۔ اس کا ہر عضو مُردہ اور ہر حس بیکار تھی۔
زینہ پر سے کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔
"کیوں ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے" یہ اس کے بیٹے شنکر کی آواز تھی۔
"اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ دماغ ایکدم بیکار ہوگیا ہے۔ تمام جسم بےحس ہے۔ اور
نبض بھی محسوس نہیں ہوتی۔" یہ اس کا طبی مشیر ڈاکٹر خان تھا۔
"تو پھر اب جلد سامان کرنا چاہئے —" اس کے بیٹے نے کہا۔
"سامان! اوہ بھگوان کیا یہ مجھے زندہ جلا دیں گے؟" رامجی نے ایک مرتبہ

پھر شنکر کو آواز دی مگر انتہائی کوشش کے باوجود ہونٹوں میں جنبش بھی پیدا نہ ہو سکی۔

"شاید تحقیقات کی جائے" اس کے بیٹے نے کہا۔ "اس لئے میں نے اس کمرہ کی کسی چیز کو ابھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ مگر وہ میز پر کیا کر رہے تھے۔ شام انہوں نے مجھ سے ایک آسامی کے کاغذات منگوائے تھے۔ آیئے ڈاکٹر صاحب دیکھیں ذرا ——"

راجی نے دونوں کے میز کی طرف جانے کی آواز سنی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھنا چاہا مگر تمام چیزیں بے حس تھیں۔ کاغذوں کے اِدھر اُدھر ہٹانے کی آواز سنی۔

"یہ کاغذ" اس کے بیٹے نے کہا "لکھ رہے تھے"۔

"دیکھوں میں" ڈاکٹر نے شاید اس کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔

"لیکن یہ تو محض بیکار ہے"۔ اس کے بیٹے نے کہا۔

"ہاں جب تک اس پر دستخط نہ ہوں یہ کسی کام کا نہیں"۔ ڈاکٹر خان نے کہا۔ "اور اب وہ دستخط کرنے سے رہے"۔

"ہاں بس بھگوان نے کرپا کی"۔ اس کا پیارا بیٹا بولا۔ "ورنہ معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تھا ——"

ڈاکٹر صاحب آپ ان کے انتقال کی تصدیق نہیں کر سکتے شنکر نے پھر کہا "ہاں میں سارٹیفکیٹ دے تو سکتا ہوں لیکن سرکاری تصدیق ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ مرض میری سمجھ میں نہیں آیا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"او بھگوان کیا واقعی یہ مجھے زندہ جلادیں گے۔" سیٹھ نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی لیکن زندگی کی کوئی علامت نہ ظاہر کرسکا۔ اس کے مُردہ جسم میں صرف ایک دماغ کام کررہا تھا اور باقی تمام اعضا اور حواس بیکار تھے۔ زینہ میں کسی کے اُترنے کی آواز سُنائی دی شاید وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔

"اب کیا کیا جائے" رامجی نے سوچا "اس کو مرنے کا غم نہیں اور اب دُنیا میں رہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے پیارے بیٹے سے اس قسم کے جملے نہ سُن سکتا تھا۔ اس نے ہر قسم کی تکلیفیں اور ہر طرح کا عیش و آرام اس دُنیا میں حاصل کرلیا تھا۔ اب مزید کسی چیز کی خواہش نہ تھی۔ ہاں اسے اس بیچاری بیوہ لکشمی کا افسوس تھا۔ شاید اس کے مقدر میں کچھ اور گردشیں باقی تھیں۔ اگر قسمت چند لمحہ اور زندگی کے دیدے تو وہ اس کاغذ پر دستخط کر دے اور بس پھر وہ زندہ بھی جلنے کو تیار ہو جائیگا۔

"ایک دفعہ اور کوشش کرکے دیکھوں" یہ سوچ کر اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں۔ اس مرتبہ آنکھیں اس کی آپ ہی سے کھل گئیں۔ جیسے کوئی اچھی طرح نیند بھر کر سونے کے بعد آنکھیں کھولدے۔ اس کو اپنی بے حس رگوں میں گرم گرم خون کی گردش محسوس ہونے لگی۔ تمام جسم میں ایک تازگی زندگی سی دوڑ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اُٹھا۔ اور مسہری سے اُترا۔ دیوار کا سہارا لیتا ہوا ڈریسنگ ٹیبل تک آیا۔ پھر اس کے سہارے سے میز کے نزدیک آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ — اس نے کاغذ اٹھایا اور پھر پڑھا۔ پڑھ کر قلم اُٹھایا اور اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں مضبوط پکڑ کر دستخط کردئیے اس

کے نیچے تاریخ ڈالدی۔

برآمدے سے کچھ کھسر پھسر کی آواز آئی۔ نوکرنی خانساماں سے کچھ کہہ رہی تھی۔ شاید اپنے آقا کی بے وقت واچانک موت پر ــــ مگر وہ تو ابھی زندہ تھا!

"مجھے ڈر نہیں لگتا ــــ چلو ایک نظر دیکھ آئیں۔" نوکرنی نے خانساماں سے کہا۔ وہ دونوں نیچے ڈائننگ ہال میں ہیں۔"

"تم جاؤ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔" خانساماں نے کہا۔

"ڈر! اپنے آقا سے ــــ راجی سے۔" راجی یہ سوچ کر مسکرایا۔

"مگر وہ تو ابھی زندہ ہے ڈر کس بات کا!"

نوکرنی نے دروازے میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔

ارے اس کا آقا تو بالکل تندرست کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ خوف اور دہشت کی وجہ سے اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور وہ نیچے کی طرف بے تحاشا دوڑی ــــ اور شاید زینہ پر سے گر بھی پڑی ــــ

راجی آہستہ سے کرسی پر سے اٹھا اور کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے مسہری کی طرف چلا۔ وہ یہ کاغذ کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینا چاہتا تھا کہ اس کی تعمیل کے متعلق کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ کسی کے زینہ پر چڑھنے کی آواز آئی۔ وہ ابھی ڈریسنگ ٹیبل تک پہنچا تھا ــــ کہ دماغ کے پچھلے حصہ میں وہی تکلیف ــــ نہایت شدید ــــ جیسے کسی نے سرخ لوہے سے داغ دیا۔ ــــ ہتھوڑے کی مسلسل ضربیں ــــ اس کو اپنی ایک ایک رگ کھنچتی ہوئی

معلوم ہوئی — جیسے کوئی رگوں میں سے رُوح کو سونت کر نکال رہا ہو — ڈاکٹر اور شنکر اندر داخل ہوئے — دونوں رامجی کو کھڑا ہوا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے — رامجی نے انکو دیکھ کر کاغذ دکھایا گویا وہ ان کو دینا چاہتا ہے — آنکھوں کے سامنے تاریکی آگئی — دماغ پر اس کے وجود پر، کمرے پر، زمین و آسمان پر تاریکی ہی تاریکی — یہ شاید اس کی آخری تکلیف تھی — اس کو ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس ہوا اور وہ گر پڑا — ڈاکٹر نے دوڑ کر اس کو سنبھالا اور کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا — دونوں نے سہارا دیکر مسہری پہ لٹایا — اس مرتبہ موت کی تمام علامات صاف ظاہر تھیں — وہ رامجی کی آخری تکلیف تھی۔

"او معبود!" ڈاکٹر نے حیرت سے کاغذ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شنکر"

"کیا ہے؟" شنکر نے کہا۔

"انہوں نے اس پہ دستخط کر دیئے" ڈاکٹر نے حیرت زدہ آواز میں کہا "وہ مسہری سے اُٹھے میز تک گئے اور اس پہ دستخط کر دیئے!"

شنکر یہ سُن کر مبہوت رہ گیا — ہیں یہ کیا ہوا — غریب بیوہ کی قسمت! "دیکھوں ہیں"۔ شنکر نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اب عدالت میں پیش ہوگا" ڈاکٹر نے جلدی سے کاغذ کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا ٭

چاقو کا پھل

شام کا وقت تھا۔ مارچ کی ایک خنک اور غیر دلچسپ شام۔ غیر دلچسپ میں نے کیوں کہا غالباً" مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ دوسروں کیواسطے یہ شام رنگینیوں، لطافتوں اور رعنائیوں سے بھرپور ہو۔ ممکن ہے کہ دوسرے اس شام میں رومانی فضا محسوس کر رہے ہوں۔ لیکن میرے واسطے سب سے زیادہ خنک شام تھی۔ آپ خود بتایئے آبادی سے میلوں دور، گھنے جنگلوں اور باغات کے بیچ ہسپتال کی عبرت خیز اور درد انگیز فضا میں ایک ڈاکٹر کے لیے کیا چیز مسرت بخش ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر جس کے کانوں میں ہمیشہ کبھی مریضوں کی چیخیں۔ اور دل خراش صدائیں گونجتی ہوں۔ جس کی آنکھیں ہمہ وقت درد اور ٹیس بلکہ اس سے زیادہ خون اور پیپ سے بھرے ہوئے پھوڑوں اور پھنسیوں اور زخموں کو دیکھتی ہوں۔ آخر انسان ہے۔ ان پریشان کن چیزوں سے گھبرا سکتا ہے لیکن اس ڈاکٹر کی مجبوری کا عالم دیکھئے جو اِن چیزوں سے نجات پاکر بھی سکون نصیب نہ ہو سکے جس کی آنکھیں بہتے ہوئے خون اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کے زخموں پر سے اُٹھ کر بھیانک وحشتناک اور تاریک جنگلوں میں کھو جاتی ہوں۔ جس کے کان دلدوز نعروں اور قلب کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی آہوں سے بچکر بھی جنگل کے وحشی درندوں کی وحشتناک آوازیں سنتے ہوں۔

میں انہی چیزوں سے گھبرا کر شام کو اپنے مختصر سے بنگلے کے برآمدے میں کرسی ڈالے نیم دراز لیٹا ہوا دماغی کوفت کو تخیل کی رنگینیوں میں محو کر دینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آج خاص طور پر خیال رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا صبح کی تازہ اطلاع سے معلوم ہوا تھا کہ ایک نواب صاحب مریض تشریف لا رہے ہیں۔ یہ خبر بذاتِ خود پریشان کن نہ تھی۔ لیکن ان کے مرض کے اطلاعیں اور بیماری کے حالات پریشانی کا باعث تھے۔ خدا معلوم کس بیماری میں مبتلا تھے کہ اعضاء توانا خوب تندرست صحت اچھی البتہ چہرہ ایک خاص کیفیت کا آئینہ دار تھا جو نہ درد و کرب کی مظہر تھی نہ فرحت و انبساط کی علامت ایک عجیب حالت — ایک انوکھی کیفیت — اچھے خاصے باتیں کرتے، دنیا کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں حصہ لیتے لیکن کبھی کبھی یکایک چہرہ کا رنگ سفید ہو جاتا — سرخ پڑ جاتا — جیسے تمام بدن کا خون کھنچ کر چہرہ میں آ گیا ہے۔ بے ہوش ہو جاتے اور ایسی جگر خراش چیخیں اس عالمِ بے ہوشی میں نکلتیں کہ ہوش والوں کے دل دہل جاتے۔

کوئی ڈاکٹر مرض کو نہ سمجھ پایا۔ سب حیران اور پریشان تھے۔ کوئی حکیم۔ وید اور ڈاکٹر ایسا نہ تھا جس نے ان کی حالت کو دیکھ کر قدرتِ خداوندی اور مشیتِ ایزدی کے سامنے سر جھکا کر اپنی بے بسی کا اظہار نہ کیا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ دیکھئے کب نواب صاحب آئیں۔ جب بڑے بڑے سول سرجن اور اعلیٰ سے اعلیٰ حکیم مرض نہ سمجھ سکے تو میں کیا ہوں۔ میں بھی آخر صرف ڈاکٹر ہی ہوں۔ جو میں سوچ سکتا ہوں وہی ان کے دماغ میں بھی آ

سکتی ہے۔ نہ اب تک وہ سمجھ سکے ہیں اور نہ شاید میں سمجھ سکوں گا۔

(۲)

میں ابھی صبح کا ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ معلوم ہؤا نواب صاحب آ گئے ہیں انہیں دروازے تک لینے گیا۔ خوبصورت آدمی، گٹھا ہؤا جسم معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں ورزش کا شوق رہا ہوگا۔ باتوں سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ مگر چہرہ پر ایک عجیب کیفیت تھی — میں نے ناشتہ میں انہیں بھی شریک کر لیا۔ دورانِ گفتگو میں معلوم ہؤا کہ وہ اکیلے آئے ہیں صرف ان کا پرائیویٹ سکریٹری ان کے ساتھ ہے۔ اور ہیں بھی اکیلے ہی — بیگم صاحبہ عرصہ ہؤا داغِ مفارقت دے چکیں۔ ولی عہد عین جوانی میں رخصت ہوئے، باقی دو اولادیں بھی بھائی اور ماں کے بغیر نہ رہ سکیں۔ یہ مرض گذشتہ چند سال سے پیدا ہو گیا ہے سوائے اس کے اور کوئی شکایت نہیں کہ کبھی کبھی دل گھبراتا ہے اور پھر معلوم نہیں کہ عالمِ بے ہوشی میں کیا گذرتا ہے۔ اب ریاست سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور بھتیجہ کو نواب بنا دیا ہے۔ بس یہ تھا ان کا کل حال۔

میں نے نواب صاحب کا علاج بہت محنت اور غور سے شروع کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ نواب تھے بلکہ اس لئے کہ وہ دکھی تھے اور میرا دل بھی درد سے ناآشنا نہ تھا۔

ان کی آنکھوں کی مایوسی و حسرت نے جس میں ناکامی و بے بسی کی چمک تھی مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ مجھے نواب صاحب سے ایک خاص ہمدردی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ میں خود بھی نہ سمجھ سکا تھا۔ ہر وقت ان کی دل بستگی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش

کرنا۔ میری اس پیہم خدمت اور ہمدردی سے ان کا دل کچھ ٹھہر گیا۔ وہ اضطراری کیفیت بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ میں بھی اب ان کے مرض کو کچھ کچھ سمجھ چلا تھا۔ جس شخص کے دل پر اتنے زخم ہوں اس کو مرہم کی نہیں چشم نم کی اور دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی دورے والی کیفیت بھی خود بخود کم ہو گئی تھی۔ ان کو بھی میری ذات سے کچھ ایسا اُنس ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے علیحدگی پر کسی قیمت پر راضی نہ ہو سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو بھی الگ کر دیا۔ ریاستی ونوابی کے تمام تعلقات منقطع کر لیئے اور میرے ہی ساتھ رہنے لگے۔

(۳)

وقت کو گذرتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ یا اگر لگتی ہے تو ہمارے احساس سے بالاتر ہوتی ہے۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے نواب صاحب کو تین برس گذر گئے۔ یوں تو ان کی وہ کیفیت تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن کبھی کبھی حد سے زیادہ افسردہ ہو جاتے اور گھنٹوں کسی خیال میں غرق رہتے۔ پھر ان پر جھنجھوڑنے ہلانے جلانے سے بھی کوئی اثر نہ ہوتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد خود ہوش میں آ جاتے ـــ میں جانتا تھا کہ یہ بھی کسی خطرہ کی گھنٹی اور کسی خوفناک چیز کا پیش خیمہ ہے۔

ایک دن گرمی کا موسم تھا اودی اودی گھٹائیں چاروں طرف چھائی ہوئی تھیں۔ مشرقی ممالک کا گرم آفتاب دیر سے اپنا منہ چھپائے ہوئے تھا اور اب اونچے اونچے درختوں کے پیچھے روپوش ہونیوالا تھا۔ شہتوت کے گھنے درختوں پر خوشنما پرندوں کے جوڑے شام کا الوداعی ترانہ گا رہے تھے بنگلہ کے سامنے چھوٹے باغیچہ میں اور نواب صاحب کرسی ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ان پر وہی کیفیت طاری

ہوئی۔ یہ کوئی نئی یا پریشان کن بات نہ تھی کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ لیکن آج نہ معلوم کیوں میرا دل گھبرانے لگا۔ جب گھنٹہ دو گھنٹہ گذر گئے۔ اور وہ کیفیت رفع نہ ہوئی تو پریشانی اور بڑھ گئی میں نے انہیں ہلایا۔ دوا سنگھائی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے مگر بے سود۔ آخر کمپونڈر کی مدد سے انہیں کمرے میں لاکر مسہری پر لٹا دیا۔ اور ان کے سرہانے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ مجھے آج سے کچھ عرصہ قبل کی گفتگو یاد آ گئی۔ ایک دن نواب صاحب کی طبیعت کچھ بحال تھی۔ بیماری کا تذکرہ چھڑ گیا۔ کہنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب میری بیماری کیا ہے۔ وہ آپ جانیں یا خدا لیکن آپ اسے کچھ سمجھ نہ سکے اِس لئے صرف خدا ہی جان سکتا ہے۔ اب میرے مرنے کے بعد آپ پوسٹ مارٹم کر کے دیکھئے گا کہ یہ کیا چیز ہے جو میرے دل کو پریشان کرتی ہے۔"

میں نے کہا۔" آپ ایسی کیوں باتیں کرتے ہیں۔ مرض وغیرہ کچھ نہیں ہے آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔ اصل میں آپ بہت رقیق القلب واقع ہوئے ہیں پھر حادثات اتنے ہوئے ہیں اسی وجہ سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

نواب صاحب (ایک آہِ سرد بھر کر بولے) "نہیں یہ بات نہیں کچھ تو ہے۔ تم نے میری اتنی ہمدردی اور جاں سوزی سے تیمارداری کی ہے کہ دوسرا شاید نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ مرنے کے بعد تم میری لاش کا پوسٹ مارٹم ضرور کرنا صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اسے تم میری وصیت سمجھو۔"

میں نے ان کا خیال بدلنے کیلئے کہا۔" چھوڑئیے بھی کس تذکرے کو لے بیٹھے آپ۔"

کمرے میں لگے ہوئے کلاک نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجائے۔ اسکی آواز سن کر میں چونکا اور خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ باہر بھی بارش کا تار ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا بالکل رُکی ہوئی تھی سخت حبس تھا۔ نواب صاحب کی وہی کیفیت تھی۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اونچے اور گھنے درخت کمرے کے دریچہ میں سے دیو کی طرح نظر آرہے تھے۔ میں اسی فکر میں تھا کہ دیکھئے اب کیا ہو۔ یکایک نواب صاحب نے ایک لمبا سا نفس لے کر کروٹ لی۔ میں نے آلات سے دیکھا تو وہ کیفیت ختم ہو چکی تھی اور نیند نے انہیں اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور انہیں کی برابر پنکھا لگا کر سو گیا۔ گرمیوں میں بھی اس وحشت خیز جگہ میں کمرے ہی میں سونا پڑتا تھا کیونکہ درندے اور جنگلی جانور ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

(۴)

صبح چار بجے میری آنکھ کھل گئی۔ جلدی سے نواب صاحب کو دیکھا۔ وہ ابھی سو رہے تھے رات کی کیفیت کا کوئی اثر چہرہ پہ نہ تھا لیکن چہرہ تمتمایا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ سخت بخار چڑھا ہوا تھا۔ میں نے برقی پنکھا بند کر دیا۔ اور کمبل اڑھا کر پاس والے غسل خانہ میں جا کر منہ دھونے لگا۔ آج اتوار کا دن تھا اسلئے عام شفا خانہ بند تھا۔ صرف ذاتی کمروں میں جا کر مریضوں کو دیکھنا تھا۔ میں نے غسل کر کے ناشتہ کیا اور کمپونڈر کو نواب صاحب کے پاس بٹھا کر خود مریضوں کو دیکھنے چلا گیا۔ تین چار گھنٹہ ان کے دیکھنے میں لگے مجھے برابر نواب صاحب کا خیال آرہا تھا۔ آج غیر معمولی حالت تھی اور ساتھ ہی ساتھ

ان کی اس دن والی وصیت کا بھی خیال آجاتا۔ میں واپس آکر نوابصاحب کے کمرے میں گیا۔ اب ان پر پھر دورے والی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ان کے جگر خراش نعرے مرنیوالے کے دل کو دہلا رہے تھے۔ میں نے کمپونڈر سے پوچھا "یہ حالت کس وقت ہوئی"

کمپونڈر "ابھی کوئی آدھ گھنٹہ ہوا۔ نواب صاحب نے ذرا آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا اور کہا تربوز۔ میں ابھی کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ یہ کیفیت طاری ہو گئی"۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا۔ اس حالت اور بخار میں تربوز کی خواہش عجیب تھی۔ میں خود نواب صاحب کے پاس بیٹھا اور کمپونڈر کو مریضوں کے پاس بھیجدیا۔ آدھ گھنٹہ بعد وہ کیفیت رفتہ رفتہ کم ہو گئی اور ایک گھنٹہ میں بالکل ختم ہو گئی مگر بخار نے اندیشہ ناک صورت اختیار کر لی تھی اور ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس ہذیان میں بھی ناتمام جملوں اور بے ترتیب فقروں سے تربوز کھانے کی زبردست خواہش پائی جاتی تھی۔ میں نے ہر چند غور کیا لیکن نفسیاتی یا طبی کسی اصول سے بھی یہ نہ سمجھ سکا۔ کہ کس جذبہ کے ماتحت تربوز جیسے معمولی پھل کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ مختلف دوائیں پلانے سے اور تمام دن کی متواتر کوشش کے بعد کہیں شام کو چار بجے کے قریب وہ ہذیانی کیفیت ختم ہوئی اور نواب صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھ کر ایک عجیب انداز میں مسکرائے میں نے سماگو دانہ کے واسطے پوچھا۔ انہوں نے سر ہلا کر منع کیا اور کہا "تربوز" —— میں نے کہا "نواب صاحب ابھی تربوز کہاں۔ اس کا موسم تو کافی دور ہے"۔

یہ سن کر نوابصاحب اس انداز سے ہنسے جیسے وہ سمجھ گئے کہ میں انہیں

بھگا رہا ہوں۔ اس موسم میں تربوز واقعی بہ افراط تھے اور کوئی ایسی قیمتی چیز بھی نہ تھی جو مہیا نہ کی جا سکتی ہو۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں نواب صاحب کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے تربوز دینے سے بہتر زہر کے چند قطرے ہوں گے۔

نواب صاحب کا اصرار تربوز کے واسطے بڑھتا جاتا اور میں ہر مرتبہ بہ لطائف الحیل ٹال دیتا۔ وہ رات تو خیریت سے گذر گئی۔ دوسرے دن پھر صبح کو نوابصاحب کی حالت خطرناک ہو گئی بخار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اگر دو درجہ اور بڑھ جائے تو قلب کی حرکت بند ہو جانا یقینی تھا۔ ہذیانی کیفیت بہت بڑھ گئی اس میں بھی اسی عجیب خواہش کا اظہار اور اسی ایک چیز کی تمنا پائی جاتی تھی۔ میں کمپونڈر کو بٹھا کر سختی سے منع کر گیا تھا کہ تربوز کا ذکر ہرگز نہ آنے دینا کیونکہ اس حالت میں تربوز کا دینا دیدہ دانستہ زہر دینے سے کم نہیں میں خود مریضوں کو دیکھنے چلا گیا۔ تین چار گھنٹے بعد میں واپس ہوا۔ ایک اور مریض کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ میں آہی رہا تھا کہ ایک نوکر دوڑا ہوا آیا کہ نوابصاحب کی حالت خطرناک ہے اور بس دم بر لب ہیں۔ میں پہنچا تو کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ بے کسی و بے بسی کا مرقع مجبوری و مایوسی کی تصویر اس وقت موت کی آغوش میں تھا۔ کمپونڈر نے کہا کہ مرحوم کے آخری الفاظ جو میں اچھی طرح نہ سمجھ سکا غالباً تربوز کے متعلق تھے۔

(۵)

نواب صاحب کی وصیت کے مطابق اب سب سے پہلے پوسٹ مارٹم کرنا تھا۔ ہر چند

کہ میرا دل نہ چاہتا تھا کہ اپنے عزیز دوست کے حلق پر چھری چلاؤں مگر ڈاکٹری نام ہی اس چیز کا ہے۔ آپریشن رُوم میں لے جا کر میں نے آپریشن کیا۔ دِل کا معائنہ کرنا تھا۔ کیونکہ نواب صاحب بار بار دِل کی تکلیف سے گھبراتے تھے اور کہتے تھے کہ میرا دِل بھاری ہو رہا تھا۔ جب دِل نکالا تو وہ معمُول سے کچھ زیادہ بڑھا ہُوا تھا۔ میں نے دِل کا آپریشن کیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دِل کے اندر کسی سیاہ دھات کا تین اِنچ کا ٹکڑا نکلا۔ چند منٹ کے لئے مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ تینتالیس سال کے طبی تجربہ میں آج تک کبھی میں نے اس قسم کے مرض یا مریض کی بابت کبھی کچھ نہ سُنا یا پڑھا تھا۔ اور نہ اس قدر حیرت انگیز چیز جسم انسانی میں دیکھی تھی۔ میں نے اُس ٹکڑے کو نکال لیا اور دِل کو اس کے مقام پر رکھدیا۔ نواب صاحب کے متعلقین کو پہلے ہی تار دے دیا تھا اب آٹھ گھنٹے گذر چکے تھے۔ لیکن کوئی جواب ابھی تک نہ آیا تھا۔ کار کے ذریعہ بھی چار گھنٹے سے زیادہ کا راستہ نہ تھا۔ بہر حال شام کے ۵ بجے تک اور انتظار کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ چھ بجے شام کو جب کسی قسم کی کوئی اطلاع نہ موصُول ہوئی تو اس حسرت و مایُوسی کی آخری تصویر کو میں نے بنگلہ کے احاطہ میں ہی سپردِ زمین کر دیا۔

(۶)

وقت کو گذرتے دیر نہیں لگتی اس واقعہ کو یعنی نواب صاحب کے انتقال کو پُورے تین برس گذر گئے۔ اس لوہے کے ٹکڑے کو میں نے اپنے عزیز دوست کی یادگار میں ایک ہاتھی دانت کے دستہ میں چاقو کے پھل کی صُورت میں لگوا لیا

اور ہر وقت اس کو اپنے پاس رکھتا جو مجھے عزیز دوست کی یاد دلاتا رہتا۔

ایک دن وسطِ ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست سے مجھے ایک تار ملا۔ راجہ صاحب نے شکار کی دعوت دی تھی۔ جو شخص دن رات انسانی لاشوں سے کھیلتا رہتا ہو اسے حیوانات کے شکار سے کیا احتراز ہو سکتا ہے۔ دوسرے میری طبیعت بھی ان دنوں کچھ گھبرا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہے ذرا لطف بھی رہے گا۔ رات کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ صبح کو ریاست پہنچ گیا۔ اسٹیشن پر راجہ صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری موجود تھے۔

تین چار دن شکار میں پُرلطف کٹے سب کوفت رفع ہو گئی۔ شکار کے بعد راجہ صاحب کی صحبت خوب پُر لطف رہی۔ ریاست میں عجیب عجیب چیزیں تھیں۔ راجہ صاحب نے ایک بالی اناج کی دکھائی جس میں کُل اقسام کے اناج موجود تھے۔ راجہ صاحب نے بتایا کہ یہ کالنجر کے علاقہ سے منگوائی ہے۔

ایک دن دورانِ گفتگو میں تربوزوں کا ذکر آ گیا۔ راجہ صاحب نے کہا کہ "ہمارے خاص باغ میں اتنے بڑے اور اعلیٰ تربوز ہوتے ہیں کہ شاید و باید ہم نے خاص طور پر ان کو لگوایا ہے"۔ میں نے اشتیاق ظاہر کیا۔ راجہ صاحب نے حکم دیا کہ بہترین قسم کا سالم تربوز لایا جائے۔ چنانچہ خاصہ کے بعد تربوز آیا۔ اللہ اکبر! میں نے بھی بہت سے تربوز دیکھے تھے۔ لیکن اس قدر بڑا بھاری اور خوش رنگ کبھی نہ دیکھا تھا۔ بس یہ جی چاہتا تھا کہ اسے دیکھا ہی کیجئے۔

راجہ صاحب نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ابھی تو آپ صرف اُوپر کی ہی رنگ و روغن پر فریفتہ ہو رہے ہیں ذرا اندر سے بھی تو دیکھئے خون کبوتر سے زیادہ سرخ

مسٹر سجاد حسین ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس تحصیل بازار لاہور میں چھپوا کر بازار سریانوالا لاہور سے شائع کیا۔

نکلے گا۔

خادم نے تربوز مع طشت کے میرے سامنے رکھدیا۔ میں نے اپنی جیب سے چاقو نکالا اور ایک طرف شگاف دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چاقو اندر گھس کر رہ گیا اور تربوز کو کاٹ نہ سکا۔ میں نے اسے اُوپر کھینچ لیا۔ ہاتھی دانت کا دستہ میرے ہاتھ میں تھا اور چاقو کا پھل —— جو میرے عزیز ترین دوست کا لختِ دِل تھا تربوز میں تحلیل ہو کر رہ گیا —— ! نواب صاحب کی تربوز کی خواہش کا راز اب میری سمجھ میں آ گیا +

ایک جلد میں تین بہترین ناول۔ لکھنے والوں میں سمرسٹ ماہم انیڈرے گائیڈ ایسے ماہرین فن شامل ہیں ترجمہ آسان اور دل نشین ہے .. قیمت تین روپے

کھیل ———— خدیجہ مستور۔

ایک عورت کے جذبات ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے خدیجہ مستور نے نسوانی فطرت کے تمام گوشوں پر ماہرانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کے افسانے آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیں گے .. .. قیمت دو روپے

چرکے۔ ہاجرہ مسرور۔ ہاجرہ مسرور کا شمار ترقی پسند افسانہ نویس خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کا آرٹ مکمل ہے ان کا ہر افسانہ نشتر بن کر آپ کے دل میں اُتر جائیگا۔ .. .. عہ

نئی کروٹیں مرتبہ قمر تسکین۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب نے بھی ایک نئی کروٹ بدلی ہے اس مجموعہ میں مشہور ترین لکھنے والوں کے ایسے شاہکار شامل کیئے گئے ہیں جو نئے تقاضوں اور نئے رجحانات کے آئینہ دار ہیں۔ قیمت .. .. .. عہ

باندی ———— انتصار حسین نیوتنوی

سماج کے ظلم وستم کیخلاف ایک باندی کی آواز دلچسپ ناول جس کے ہر باب سے زندگی کے تلخ حقائق جھانک رہے ہیں۔ قیمت ۱۲/

پہلا گناہ ———— ٹالسٹائی

ٹالسٹائی کے دو موثر ترین ڈرامے۔ ترجمہ خلیل بی اے علیگ

رزم و بزم جاں فروز، حیرت آموز افسانوں کا پُر لطف مجموعہ مرتبہ مولانا تاجور و پروفیسر لاجپت رائے نیر ایم۔ اے۔ قیمت بغیر جلد دس آنے ۱۰/

نئی فضائیں۔ ہندوستان کے ان بلند پایہ ترقی پسند افسانہ نویسوں کی ادبی کاوشوں کا حسین و جمیل مجموعہ جن کا نام آسمانِ صحافت پر درخشاں ستاروں کی طرح جگمگا رہا ہے۔ مجلد کتاب گردپوش سے مزین قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

طلسم سامری۔ ایم اسلم کی مشہور و معروف تصنیف جو متعدد بار طبع ہو کر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو چکی ہے۔ مجلد کتاب قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ

کتب خانہ اُردو۔ ۲۳ کبیر سٹریٹ انارکلی۔ لاہور

اُردو کی تازہ ترین مطبوعات

کھیل محترمہ خدیجہ مستور کے قلم سے نکلے ہوئے گیارہ نشتر۔ کہنہ مشق کھلاڑیوں کے نام یہ گیارہ نشتر سماج کی دُکھتی ہوئی رگ پر لگائے گئے ہیں پڑھیں اور لُطف اُٹھائیں۔ قیمت مجلد دو روپے

چرکے محترمہ ہاجرہ مسرور کے شاہکار افسانوں کا رنگین مجموعہ ہر افسانہ نئے رومان سے لبریز اور ہر رومان میں سینکڑوں چرکے پوشیدہ ہیں مجلد کتاب قیمت دو روپے چار آنے۔ عہ؍

معاشقے اُن انسانوں کے تاریخی رُومان جنہوں نے خود محبت کی یا جن سے محبت کی گئی۔ محبت کرنا انسان کا ایک فطری جذبہ ہے محبت اندھی ہوتی ہے محبت حاکم و محکوم کے درمیان امتیازی نشان نہیں رکھتی محبت تاج و تخت سے بے نیاز ہوتی ہے اگر آپ یہ دیکھنا چاہتے ہیں تو کتاب معاشقے مصنفہ قمر اجنالوی کا مطالعہ فرمائیں قیمت عہ؍

راکھی انتصار زیونتوی کا دوسرا آتشیں ناول راکھی ایک راجکمار کی داستان جس کو قدرت نے غریب امیر کی تفریق مٹانے والا دل عطا فرمایا تھا وہ اکثر گاؤں میں جاکر دیکھتا کہ لوگ کمزور انسانوں سے حیوانوں جیسا سلوک کرتے ہیں مگر اُنکے دل میں رحم کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ان تمام واقعات کو راجکمار کی زبان سے سُنیں مجلد کتاب قیمت ایک روپیہ چار آنے عہ؍

باندی سماج کے ظُلم و ستم کے خلاف ایک باندی کی آواز۔ جسے مشہور افسانہ نویس انتصار زیونتوی نے ناول کے دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے پڑھیں اور لُطف اُٹھائیں۔ مجلد کتاب ایک روپیہ بارہ آنے عہ؍

دُنیا کے تین بہترین ناول یُورپ کے نامور ادیب ایڈورڈ گائیڈ اور سمرسٹ ماہم کے شہرہ آفاق انگریزی ناولوں کا اُردو ترجمہ ایک جلد میں تین انتہائی دلچسپ ناول مجلد کتاب تین روپے

رزم و بزم جانفروز حریت آموز افسانوں کا پُرلطف مجموعہ مرتبہ مولینا تاجور و پروفیسر لاجپت رائے بیتر ایم اے۔ قیمت بغیر جلد دس آنے ۱۰؍

نئی فضائیں ہندوستان کے اُن بلند پایہ ترقی پسند افسانہ نویسوں کی ادبی کاوشوں کا حسین و جمیل مجموعہ جن کا نام آسمانِ صحافت پر درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگا رہا ہے مجلد کتاب قیمت دو روپے آٹھ آنے عہ؍

یاما: حُسن فروشی کی دردناک کہانی جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُن عورتوں کی لرزہ خیز داستان جو دُنیا میں مردوں کی نفس پرستی پر قربان کیجاتی ہیں۔ الیگزنڈر کپرن کا شہرہ آفاق ناول مکمل تین جلد صہ؍

پہلا گُناہ ٹالسٹائی کا نام ادبی دُنیا میں روز روشن کی طرح واضح ہے۔ آپکے دو عظیم ترین ڈراموں کا بے حد لفریب ترجمہ ہے قیمت ایک روپیہ چار آنے

داستانیں یُورپ کے ممتاز ادیبوں کی شہرت کا باعث افسانہ نگاری ہی ہے جو بہت ہی مقبول و محبوب بن چکی ہے اب چند سال سے ہمارے ملک میں بھی افسانوں کو بے حد پسند کیا جا رہا ہے اس کتاب میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔ ناگ دیوتا۔ سدوم کی تباہی ایتھنز کی ساحرہ۔ طلسمی کھنڈر۔ تمام افسانے تاریخی ہونے کی حیثیت سے بیحد دلچسپ ہیں مصنفہ قمر اجنالوی قیمت مجلد عہ؍

قلوپطرہ کی ایک رات انگریزی کے معرکہ آرا چھ طویل مختصر افسانوں کا ترجمہ جو طرز ادا کی رنگینی اور بیان کی دلکشی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں ہر افسانے کو آپ بار بار پڑھنے پر مجبور ہونگے عنوان ملاحظہ فرمائیں۔ قلوپطرہ کی ایک رات۔ رات کی بات۔ الحمرا کی آخری شمع۔ چرواہا۔ ناگ دیوی۔ بابک کا خواب حجم دو سو صفحے سے زائد۔ ترجمہ شبلی بی کام مجلد قیمت عہ؍

شعاعیں: مرتبہ شبلی بی کام ہندوستان کی تمام زبانوں میں لکھنے والے ۱۵ مشاہیر افسانہ نویسوں کے افسانوی شاہکار۔ اُردو میں پہلی مرتبہ اپنی قسم کا واحد مجموعہ ضخامت تین سو صفحات سے زائد مجلد کتاب قیمت تین روپے چار آنے

خلش: خالدہ حسن قادری کے ۱۵ عدد تازہ ترین افسانے جن میں حقیقت و رومان کو اس خوبی سے سمویا گیا ہے کہ آپ جھوم اُٹھیں گے۔ پلاٹ۔ زبان اور کردار کے اعتبار سے یہ افسانے دُنیائے ادب میں امتیازی شان رکھتے ہیں حجم دو سو صفحات مجلد کتاب قیمت عہ؍

خوشبوئیں: مرتبہ شبلی بی کام ہندوستان کی مایہ ناز افسانہ نویس خواتین کے لکھے ہوئے افسانے جو نسائی لطافت و نزاکت کے آئینہ دار ہیں اور مشرقی معاشرت کی صحیح ترین عکاسی کرتے ہیں ضخامت تین سو صفحات قیمت

دیوانِ جگر: جگر کے مشہور کلام کا مختصر مجموعہ قیمت عہ؍

نئی کرنیں اُن بلند پایہ افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا مجموعہ ہے جنکے اسمائے گرامی شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں قیمت مجلد عہ؍

کتب خانہ اُردو ۳ کبیر سٹریٹ انارکلی لاہور

مغرب کے بہترین افسانے یورپ اور امریکہ کے چنے ہوئے دلکش افسانے جن کا شمار دُنیا کی بہترین کہانیوں میں ہوتا ہے قیمت عہ؍

کتاب... زریں... لاہور

لاہور کے دیگر کتب خانوں کی کتابیں بھی آپ ہم سے طلب فرمائیں